بوڑھا شباب

ایک ایسے نوجوان کی داستان جو ایک حسین اداکارہ کے جلووں
کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کا تجسّس اسے آگے ہی آگے لے جاتا رہا۔
جب اسے ہوش آئی تو وہ سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔
وہ اپنی بربادی کا انتقام لینے نکلا تھا۔ مصنوعی جلووں کے سحر میں
گرفتار ہو کر تباہ ہونے والے نوجوان کی دل گداز داستان

اشرف تیرہ سال کا تھا۔ تیرہ سال عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ابھی تو اس کے بالائی ہونٹ کے اوپر سیاہی بھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ ہاں دیہاتی آب و ہوا اور خالص خوراک کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے تھوڑا سا بڑا نظر آتا تھا۔ وہ آٹھویں میں پڑھتا تھا مگر اپنے گاؤں سے لاہور آنے کے بعد اسے ساتویں میں داخلہ ملا تھا اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ لاہور نے اشرف کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے گھر کے جستی ٹب میں نہاتے نہاتے ایک بڑے دریا میں تیرنے لگ پڑا ہے۔ وہ لاہور کی وسعت، اس کی رنگینی اور گہما گہمی کو حیرت سے دیکھتا تھا اور حیران تر ہوتا تھا۔ جیسے اچانک بلی کا کوئی بچہ کسی تاریک گوشے سے نکل کر کھچا کھچ بھرے ہوئے ایک بہت بڑے اسٹیڈیم میں پہنچ جائے اور گراؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر تعجب سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اسے لاہور بڑا دلچسپ لگا تھا، وہ روز بہ روز اس میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے حال میں اتنا مگن ہوتا تھا کہ اپنے جانَ سے پیارے ماموں ارشاد اور ان کی جان سے پیاری بیٹی تارا کو بھی بھول جاتا تھا۔ اشرف اور تارا بچپن سے اکٹھے کھیل کر بڑے ہوئے تھے دونوں میں بے پناہ انس تھا۔ ابھی وہ دونوں عمر کی اس حد تک نہیں پہنچے تھے کہ اس انس کو کوئی اور نام یا رنگ دیا جا سکتا تھا پھر بھی وہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ گاؤں میں دونوں گھرانے پاس پاس رہتے تھے بلکہ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی لیکن یہاں لاہور میں ماموں کو جو گھر ملا تھا، وہ ڈیڑھ دو فرلانگ کی دوری پر تھا۔ یہ دوری کچھ بھی نہیں تھی پھر بھی شروع شروع میں اشرف کو اور اس کے گھر والوں کو بری طرح محسوس ہوئی تھی۔

لاہور آکر اشرف کے نئے نئے دوست بنے تھے۔ ان میں کچھ اسکول کے تھے اور کچھ گلی محلے کے۔ دو تین دوست تو بلا تردد اس کے گھر بھی آتے جاتے تھے۔ اشرف چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اس لئے کافی لاڈلا بھی تھا۔ جب اشرف اپنے کسی دوست کو گھر میں لاتا تو امی اس کی خوب خاطر مدارات کرتیں۔ اس کی بڑی بہن

عارفہ بھی اشرف کے خوب لاڈ اٹھاتی تھی۔ اشرف کے خاص دوستوں میں جہانگیر نامی لڑکا ان کا محلے دار بھی تھا، اس کے ابو وکیل تھے۔ وہ خاصا تیز و طرار اور باتونی لڑکا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اشرف کا سب سے قریبی دوست بن گیا تھا۔ بیشتر وقت وہ اشرف کے گھر میں گھسا رہتا تھا یا پھر اشرف اس کے گھر میں موجود پایا جاتا تھا۔

لاہور آکر اشرف کو گھومنے پھرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ تجسس تو اس کی طبع میں شروع سے ہی بہت تھا۔ وہ ہر چیز کو کھوجنا چاہتا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی اسی عادت کو دیکھتے ہوئے اس کے ماموں ارشاد نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ آرٹس کے بجائے سائنس کی طرف جائے گا اور خوب پڑھے لکھے گا۔ نئی نئی چیزوں کو کھوجنا سائنس ہی تو کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے اشرف کو لاہور میں ہر طرف سائنس ہی سائنس نظر آتی تھی۔ چھٹی کے دن امی اور آپا سے کرکٹ میچ کا بہانہ بنا کر اکثر وہ اکیلا ہی لاہور گھومنے کے لئے نکل جاتا۔ دریائے راوی، شالا مار باغ، مقبرہ جہانگیر، شاہی قلعہ، شاہی مسجد اور پھر لاہور کا اندرون، بھری پُری گلیاں، پکوان، پتنگیں، دنگل، محفلیں، کھیل تماشے۔ وہ ایک ایک شے پر غور کرتا اور انسانوں کے اس سمندر میں ڈوب سا جاتا۔

کبھی کبھی جب وہ اس گہما گہمی اور رونق سے تھک سا جاتا تو کسی باغ کے پُر سکون کونے میں اکیلا ہی کسی پتھریلی بینچ پر لیٹ جاتا اور ایسے میں اچانک ہی اسے اپنا گاؤں، اس کی خاموشی اور بے تکلفی یاد آجاتی۔ ظاہر ہے کہ ماضی اتنی جلدی تو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یادیں کیسی بھی ہوں، محو ہوتے ہوتے کچھ دیر تو لگتی ہے۔ وہ گاؤں کے تصور میں کھو جاتا۔ ان کا گاؤں ”رنگی“ پسرور سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے ڈیک نالے کے قریب واقع تھا۔

اشرف کے قریبی عزیزوں کے سات آٹھ گھرانے رنگی گاؤں میں آباد تھے۔ ان ہی میں اشرف کے ماموں ارشاد کا گھرانا بھی تھا۔ اشرف کے والد قدرت اللہ صاحب خالص مذہبی ذہن کے آدمی تھے۔ وہ بچوں کو اسکول بھیجنے کے قائل نہیں تھے۔ اشرف کی دو بڑی بہنیں تو اسکول گئی ہی نہیں تھیں، تاہم بعد میں ماموں ارشاد کے سمجھانے اور کہنے سننے سے انہوں نے باقی بچوں کو اسکول بھیجا تھا۔ گاؤں میں اشرف کے والد اور چچاؤں کی زرعی زمین تھی اور کشائش کے ساتھ گزر بسر ہو رہی تھی۔ ماموں ارشاد محکمہ انہار میں ملازم تھے، اور تھوڑی بہت زمین ان کی بھی تھی۔ گاؤں کی کئی سنہری یادیں اشرف کے ذہن پر

نقش تھیں اور انہیں ہمیشہ نقش رہنا تھا۔ گرما کی طویل دوپہروں میں اپنی ماموں زاد طاہرہ عرف تارا کے ساتھ چپکے سے گھر سے فرار ہو جانا۔ باغوں میں گھومنا' کچے پکے پھل توڑنا۔ کنوؤں کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں میں پاؤں ڈبو کر بیٹھنا اور مستی میں آکر ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانا۔ راتوں کو چھت پر سفید چادروں والی چارپائیوں کی قطاریں اور ٹمٹماتے تاروں کے نیچے ماموں ارشاد کی رس بھری کہانیاں۔ ماموں انہیں تاریخی داستانوں سے اقتباسات سناتے۔ سکندر اعظم' زوال بغداد' فتح اندلس اور پھر آخری چٹان۔ کہانی کے کردار طاہر اور صفیہ اور قاسم.......... اور تاتاریوں کی تباہ کاریاں۔ وہ سنتے سنتے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے۔ دور کہیں کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی' تاریکی میں پرندے سرسراتے ہوئے ان کے سروں پر سے گزر جاتے اور دور اوپر دیکھنے پر انہیں یوں لگتا کہ چاند تارے بھی ماموں کی داستان کے سحر میں گم ہیں۔

تارا اور اشرف شروع سے ہی بہت بے تکلف تھے۔ دو سال پہلے تک تو وہ باقاعدہ ایک دوسرے سے کشتیاں کیا کرتے تھے۔ اب خیر کشتیاں تو نہیں ہوتی تھیں مگر ہاتھاپائی اور دھینگا مشتی چلتی رہتی تھی۔ اگر ان دونوں میں سے ایک کو کہیں جانا پڑجاتا تھا تو دوسرا گمشدہ گائے کی طرح اداس پھرتا تھا۔ آپا کبھی کبھی اشرف کو چھیڑتے ہوئے کہتی تھیں "اشرفی! اتنا مت پھرا کر اس کے ساتھ۔ ورنہ یہ تیرے پلے بندھ جائے گی۔"

"پلے بندھنا" کا مطلب شروع شروع میں تو اشرف کو معلوم نہیں تھا مگر اس کی متجسس طبع نے بہت جلد امی سے معلوم کر لیا تھا اور جب یہ مطلب اسے معلوم ہوا تھا' بہت دن تک اس کے اندر میٹھی میٹھی سی گدگدی ہوتی رہی تھی۔ اس نے ایک روز گاؤں کے کھیتوں میں یونہی پگڈنڈیوں پر آوارہ گھومتے ہوئے تارا کو بتایا تھا کہ "پلے بندھنا" کا مطلب کیا ہوتا ہے اور یہ بات آپا نے کس حوالے سے کی تھی۔ تارا چھوٹی سی تھی مگر پھر بھی وہ شرمائی شرمائی نظر آئی تھی۔ اشرف کو ایک دم دھکا دے کر وہ شرارت سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی تھی۔ اشرف پانی لگے کھیت میں گرا تھا اور کیچڑ سے لت پت ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے تارا کو ماسی عائشہ کے تندور کے سامنے جا دبوچا تھا اور اسے زمین پر گرا کر بہت سا کیچڑ اس کے منہ اور سر پر پوت دیا تھا۔

رنگی گاؤں کو ڈیک نالے کی وجہ سے ہر سال خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ اس برسات میں بڑا شدید سیلاب آیا تھا۔ چار روز تک وہ لوگ چھتوں اور اونچی جگہوں پر پناہ گزیں رہے

تھے۔ آٹھ دس افراد کی ہلاکت کے علاوہ سینکڑوں مویشیوں کا نقصان بھی ہوا تھا۔ فصلیں برباد ہو گئی تھیں اور گھر منہدم ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پوری زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سیلاب نے اس خیال کو ایک دم توانا سوچ کی شکل دے دی تھی جو کئی برسوں سے اشرف کے بزرگوں کے ذہنوں میں پنپ رہا تھا۔ انہوں نے لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دو تین ماہ کے اندر ہی سارے انتظامات ہو گئے تھے۔ تھوڑی سی زمین کے علاوہ باقی سب بیچ دی گئی تھی۔ قدرت اللہ نے لاہور کی ایک متوسط آبادی گلزار ٹاؤن میں دس مرلے کا ایک بنا بنایا مکان لے لیا تھا' اور ایک دوست کے ساتھ مل کر چاولوں کا سیل ڈپو بنا لیا تھا۔ اس کام میں انہیں تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا۔ قدرت اللہ کے علاوہ ان کی برادری کے تین چار اور گھرانے بھی لاہور منتقل ہوئے تھے ان میں اشرف کے ماموں ارشاد اور چچا رشید وغیرہ شامل تھے۔

انہیں لاہور میں آئے ہوئے اب پانچ چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ لاہور اور کراچی جیسے دریا دل شہر اپنے اندر بہت کچھ جذب کر لیتے ہیں اشرف اور اس کے عزیز بھی آہستہ آہستہ یہاں جذب ہو رہے تھے۔

لاہور کے تہوار اشرف کو خاص طور سے بہت پسند آئے تھے۔ یوں تو یہ تہوار وہ گاؤں میں بھی مناتا رہا تھا لیکن لاہور میں ان کا مزہ اور رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ اسی طرح لاہور آکر وہ ٹی وی اور فلم وغیرہ سے بھی آشنا ہوا تھا۔ گاؤں میں ان کے گھر ٹی وی نہیں تھا۔ تاہم ایک دو گھروں میں تھا اور وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ چپکے چپکے جا کر دیکھ بھی آتا تھا' لیکن یہاں لاہور میں تو ہر در و دیوار کے ساتھ ٹی وی نظر آرہا تھا.......... اور ٹی وی بھی ایسا کہ الاماں۔ ڈش کے ذریعے ان گنت چینل آتے تھے۔ اس کے علاوہ وی سی آر پر بھی ہر رنگ کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ گلزار ٹاؤن میں ہی دو تین ایسے ہوٹل تھے جن پر چائے کی ایک پیالی پی کر فلم یا گانے دیکھے جا سکتے تھے۔ یہی صورت حال فلموں کی تھی۔ گاؤں میں رہتے ہوئے صرف دو بار اشرف نے فلم دیکھی تھی۔ دونوں دفعہ اشرف کے ماموں اسے لے کر گئے تھے۔ ایک دفعہ تحریک پاکستان کے پس منظر میں بننے والی فلم خاک و خون تھی اور دوسری مرتبہ ایک گھریلو قسم کی سلجھی ہوئی فلم تھی مگر یہاں لاہور میں تو ایک ساتھ درجنوں فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ سینما گھروں سے باہر ایسے ایسے پوسٹر لگے ہوئے ہوتے تھے کہ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ ان پوسٹروں میں

فلمی پریاں اپنی پوری آب و تاب سے چمکتی دمکتی نظر آتی تھیں۔

ایسی ہی فلمی پریوں میں سے ایک پری خاص طور سے اشرف کے دل پر لگی تھی۔ غالباً لاہور آکر اشرف نے جو پہلی فلم دیکھی تھی وہ اسی پری کی تھی۔ اس فلم میں اس ارمان نامی پری کا کردار ایک ایسی شریف اور شرمیلی لڑکی کا تھا جو بدقماشوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے' وہ اسے بازار حسن میں بیچ دیتے ہیں' وہاں اسے بے ہودہ ڈانسر بنا دیا جاتا ہے۔ آخر کار لڑکی کا چاہنے والا اسے ڈھونڈتا ہوا اس کلب میں پہنچتا ہے جہاں وہ لڑکی ہر رات نیم عریاں رقص پر "مجبور" کی جاتی ہے۔ وہ ایک خون ریز لڑائی کے بعد اسے بدقماشوں کے چنگل سے چھڑاتا ہے اور شریفانہ زندگی میں واپس لے آتا ہے۔

اشرف کو ارمان کا یہ کردار بڑا پسند آیا تھا' اس نے کئی بار یہ فلم دیکھی۔ وہ جب بھی اسے پردہ اسکرین پر ڈانس کرتے ہوئے دیکھتا اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگتا۔ پیٹ میں وہی مانوس گدگدی ہوتی جو ایک مرتبہ تب ہوئی تھی جب اسے "پلے باندھے جانے" کا مطلب معلوم ہوا تھا۔

ایک روز جہانگیر اس کے گھر آیا' تو اس نے جہانگیر سے کہا۔ "آؤ تمہیں ایک شے دکھاؤں۔"

"کوئی کھانے والی چیز ہے؟" جہانگیر نے پوچھا۔

"کھانے والی تو نہیں لیکن تیرا کھانے کو دل چاہے گا۔"

وہ جہانگیر کو لئے دو منزلہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ اتفاقاً چھت خالی تھی۔ اشرف نے بستہ کھولا اور حساب کی کاپی نکال لی۔

"اوئے کیا مجھے حساب پڑھائے گا؟" جہانگیر بدک کر بولا۔

"تجھے تیرے بڑے نہیں پڑھا سکے' میں کیسے پڑھا سکتا ہوں۔" اشرف نے جواب دیا۔

اشرف نے کاپی کھولی اور اس کے خاکی کور کے اندر سے اخباروں کے کئی تراشے نکال لیے۔ یہ سب کی سب فلمی اداکارہ ارمان کی تصویریں تھیں۔ کہیں وہ ڈانس کر رہی تھی کہیں نیم عریاں لباس پہنے اپنے ہیرو کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان اخبار والوں نے سیاہ مارکر سے لائن سی کھینچ دی تھی۔ اشتہار پر تو ایسی لائن کھینچی جا سکتی ہے مگر ذہن پر نہیں۔ ذہن تو ایسے موقعوں پر مٹانے والا ربڑ بن جاتا ہے اور ہر

ایسی لائن کو لمحوں میں صاف کر دیتا ہے۔ ایک تصویر میں ارمان کسی تالاب میں سے نکلی تھی اور اس کے سیمیں بدن سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اوئے باندر! یہ تصویریں تیرے ابو نے دیکھ لیں تو تجھے گھر کے دروازے کے سامنے مرغا بنا دیں گے۔" جہانگیر نے کہا۔

"دیکھیں گے کیسے۔ دو مہینے سے یہاں پڑی ہوئی ہیں۔" اشرف نے کہا۔

"ویسے یار! یہ ہیروئن ہے بڑی کڑاکے دار۔ جس فلم میں ہو ایک دم ہٹ ہو جاتی ہے۔"

"ہٹ ہو جاتی ہے؟ کیا مطلب؟"

"یار! تم نرے پینڈو ہی رہو گے' ہٹ کا مطلب ہے کہ فلم ایک دم مشہور ہو جاتی ہے۔ ابھی دو دن پہلے میرے بھائی جان وڈیو پر اس کی ایک فلم لائے تھے' اس میں میں.........."

جہانگیر بولتے بولتے ایک دم رک گیا۔ اس کا رنگ لال ہو گیا تھا اور آنکھوں میں شرارت ابھر آئی تھی۔ دائیں بائیں دیکھ کر اس نے اپنا منہ اشرف کے کان کے پاس کیا اور سرگوشی کی۔ اس سرگوشی کو سن کر اشرف کے گال بھی گلابی ہونے لگے۔

وہ پہلو بدل کر بولا۔ "لیکن یار! فلم میں تو ایسے "پاٹ" کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ماموں کہتے تھے کہ ایکٹر وہی کرتے ہیں جو فلم کا مالک کہتا ہے۔"

"مالک نہیں یار! اسے ہدایت کار بولتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ہدایت کار۔ جو بات تم نے بتائی ہے وہ ضرور اس نے ہدایت کار کے کہنے پر ہی کی ہو گی۔"

"اوئے باندر! تُو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے شہر میں' تجھے پتا ہی نہیں ہے یہاں کیسے کیسے چکر چلتے ہیں۔ اب تُو ارمان کی بات کر رہا ہے نا؟ تیرا خیال ہے کہ یہ شکل سے بڑی شریف پاک لڑکی لگتی ہے لیکن تجھے پتا ہی نہیں ہے کہ یہ کیا شے ہے۔ میں نے تو اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔"

"بہت کچھ سنا ہے' کیا مطلب؟"

جہانگیر نے ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا' پھر اشرف کی طرف جھکتے ہوئے آواز ذرا دھیمی کر لی۔ سرگوشی میں بولا "وہ اپنا یار طوطا ہے نا جو اسکول سے آکر موٹر مکینکی بھی کرتا

ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ کیا کہتا ہے طوطا؟" اشرف نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہ کہتا ہے کہ اس ارمان کی ایک بڑی تحفہ فلم بھی آئی ہوئی ہے۔"

"تحفہ فلم۔ یہ کیا ہوتی ہے؟"

"اوئے پینڈو! تحفہ فلم کا نہیں پتا تجھے؟"

اشرف نے پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور معصومیت سے نفی میں سرہلایا۔ جہانگیر کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ ابھری جس میں برتری کا احساس تھا۔ وہ بولا۔ "اوئے کبھی تم نے انگریزی فلم دیکھی ہے وی سی آر پر؟"

اشرف نے کہا۔ "ایک بار تیرے ہی گھر دیکھی تھی تیرے بھائی جان کی شادی پر۔"

"تم نے دیکھا ہو گا کہ جب فلم چل رہی ہوتی ہے تو لڑکے لڑکی کے کچھ سین ایک دم آگے کر دیئے جاتے ہیں۔"

اشرف نے جلدی جلدی اثبات میں سرہلایا۔ "ہاں' میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ کوئی "بڑا" فلم کو تیز چلا دیتا ہے یا ویسے ہی ٹی وی کو تھوڑی دیر کے لئے بند کر دیتا ہے۔"

"ہاں۔ بات تیری سمجھ میں آگئی ہے۔" جہانگیر نے دانا بینا لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل "تحفہ" فلم ساری کی ساری ایسے ہی سین والی ہوتی ہے' بلکہ یہ تو اس سے بھی آگے کی شے ہوتی ہے۔"

ایک دم اشرف اور جہانگیر میں کھلبلی مچ گئی۔ دونوں بدک کر اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اشرف جلدی جلدی تراشے اور کاپیاں بستے میں گھسیڑنے لگا۔ سیڑھیوں پر آپا عارفہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔

"اوئے باگڑ بلو! یہاں کیا کر رہے ہو؟" عارفہ نے ان دونوں کے اُڑے اُڑے رنگ دیکھ کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں آپا۔ مم......... میں تو جہانگیر کو اردو کی کتاب سے کہانی سنا رہا تھا۔"

آپا عارفہ کچھ دیر تک گھور گھور کر دونوں کو دیکھتی رہیں' پھر بولیں۔ "زیادہ کہانیوں کے چکر میں مت پڑا کرو۔ جاؤ اب نیچے' شام ہونے والی ہے۔"

دونوں کان لپیٹ کر نیچے اتر آئے۔

☆=========☆=========☆

اس دن کے بعد اشرف کو جب بھی موقع ملتا' جہانگیر کے ساتھ "تحفہ" فلم کے بارے میں اس کی بات ہوتی۔ جہانگیر کا کہنا تھا کہ وہ طوطے کے پیچھے پڑا ہوا ہے وہ ایک دو دن تک انہیں فلم لادے گا' جسے وہ گھر میں وی سی آر پر دیکھیں گے۔ دراصل جہانگیر کو اتوار کا انتظار بھی تھا۔ اتوار کے روز اس کے بھائی جان کو اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ایک شادی پر جانا تھا۔ گھر میں صرف جہانگیر کی امی کو ہونا تھا۔ ان کی جہانگیر کو زیادہ پروا نہیں تھی۔

شدید انتظار کے بعد آخر ہفتے کا دن آن پہنچا۔ ہفتے کی شام کو جہانگیر ان کے گھر آیا اور اس نے گول گول آنکھیں گھما کر اشرف کو بتایا کہ فلم آگئی ہے۔ بس اب کل بھائی جان کے جانے کا انتظار ہے۔ ساری رات اشرف نے کروٹیں بدلتے ہی گزاری تھی۔ آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انہیں کئی دن سے انتظار تھا۔ اشرف' طوطے اور جہانگیر نے ایک کمرے میں گھس کر فلم دیکھی۔ وہ فلم شاید تین چار سال پرانی تھی۔ اس میں فلم ایکٹرس ارمان کافی کم عمر نظر آتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ فلم اس کی بے خبری میں بنائی گئی ہو' یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صحیح فلم نہ ہو بلکہ ٹکڑے وغیرہ جوڑ کر کاریگری دکھائی گئی ہو' یہ بھی ممکن تھا کہ یہ سرے سے ارمان ہی نہ ہو بلکہ اس کی کوئی ہم شکل لڑکی ہو۔ اس کے علاوہ بھی کئی امکانات ہو سکتے تھے مگر امکانات پر غور کرنے کا ان لڑکوں کو ہوش ہی کہاں تھا۔

یہ ہوش ربا فلم دیکھ کر جب اشرف کمرے سے باہر نکلا تو وہ ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں بالغ ہو چکا تھا۔ اس کی معصومیت جو ذرا ذرا سی بات پر اس کے رخساروں کو گل رنگ کر دیتی تھی' ایک دم ہی اس کے اندر سے نکل کر اڑن چھو ہو گئی تھی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ گھر آکر لحاف میں پڑ رہا' اسے بخار سا چڑھ گیا تھا۔ اس کی امی اور آپا نے کئی بار اس سے پوچھا کہ کیا ہے لیکن وہ ٹال گیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ گھر والوں سے نظریں چرا رہا تھا۔

اگلے روز وہ گھر سے نکل کر سڑک پر آیا۔ اس نے جس لڑکی یا عورت کو دیکھا اسے یہی لگا کہ وہ ابھی کسی مرد کی طرف بڑھے گی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے گی' پھر اسی طرح کے مناظر شروع ہو جائیں گے جیسے اس نے فلم میں دیکھے تھے۔ اسے ہر طرف وہ فلم ہی فلم نظر آرہی تھی' یہاں تک کہ اپنے گھر میں اپنی امی اور آپا کی طرف بھی وہ نظر بھر کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

دو تین راتیں اس نے عجیب بے قراری کے عالم میں گزاریں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اندر سے بدل چکا ہے۔ کوئی تپش سی تھی جو ہر وقت اس کے نازک بدن میں جاگی رہتی تھی۔ خوب رو ارمان کا ناچتا تھرکتا بدن ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ وہ اس تصور سے گھبرا کر آنکھیں بند کرتا تو تصور اور بھی اجاگر ہو جاتا۔ اس کی گوری سفید بانہیں' اس کی پتلی کمر' اس کی صراحی دار گردن۔ اس کا حلق خشک ہونے لگتا پھر ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ ارمان کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر کچھ فاصلے پر چلا گیا اور اس تصور کے پیچھے سے ایک اور شبیہ ابھر کر سامنے آگئی۔ یہ تارا کی شبیہ تھی۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ اس کے سامنے "پلے بندھنے" کی تشریح کر رہا ہے اور تارا کے نہایت ملائم اور چکنے گال شرم سے سرخ ہو رہے ہیں۔

ایک دن اشرف کے قدم جیسے خود بخود ماموں ارشاد کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ ماموں ارشاد کو یہاں لاہور میں بھی محکمہ انہار میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ صبح کے گئے شام سات بجے گھر آتے تھے۔ ان کی آمد تک گھر میں صرف تارا' اس کی والدہ یعنی ممانی بلقیس اور تارا کا چھوٹا بھائی اصغر ہی ہوتے تھے۔ اشرف گھر میں داخل ہوا تو تارا اپنی امی کے ساتھ مل کر کپڑے دھو رہی تھی۔ امی دھو رہی تھیں وہ انہیں نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور تارا کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دیر تک ممانی کے گھر رہے۔ تارا کے پاس بیٹھے' اس سے باتیں کرے۔

اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ خود ہی مسکرا دیا۔ گاؤں میں وہ اور تارا "گھر گھر" کھیلا کرتے تھے۔ کچھ اور بچے بھی اس کھیل میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ وہ چھت پر چلے جاتے' چارپائیاں جوڑ کر ایک گھر سا بناتے۔ اس گھر میں اشرف اور تارا میاں بیوی کا کردار ادا کرتے۔ کوئی بچہ چاچو بن جاتا' کوئی امی اور کوئی نوکر۔ جھوٹ موٹ کی بھینسوں کا ذودھ دھویا جاتا۔ خیالی چولھے میں تصوراتی آگ جلا کر جھوٹ موٹ کی روٹیاں پکائی جاتیں اور مزے سے کھائی جاتیں۔ نہ جانے کیوں آج اشرف کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں پھر سے "گھر گھر" کھیلیں لیکن یہ تو تین چار سال پہلے کی باتیں تھیں' اب ان کی عمر گھر گھر کھیلنے کی نہیں رہی تھی۔

کچھ دیر بعد تارا فارغ ہو گئی۔ اسی دوران میں بڑے چاچو انعام اللہ کے بچے بھی

آگئے۔ انہیں ایک دوبار اشرف نے کہانی سنائی تھی اور وہ بڑے محظوظ ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اشرف نے کہا۔ "راجو۔ گڈو! آؤ تمہیں کہانی سناؤں۔"

بچے خوش ہو گئے لیکن تھوڑا سا حیران بھی ہوئے کہ اس سے پہلے تو فرمائش پر بھی نہیں سناتا تھا' آج بغیر فرمائش کے دن دیہاڑے سنانے پر آمادہ ہے۔ اشرف انہیں لے کر دوسری منزل پر واقع ایک کمرے میں آگیا۔ تارا بھی ساتھ ہی تھی۔ اشرف اگر ساڑھے تیرہ سال کا تھا تو تارا تیرہ کی ہو گی۔ گڈو بارہ سال کا تھا' راجو ابھی نرسری میں تھا۔

اشرف پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ تارا سمیت باقی تینوں اس کے ارد گرد پھیل گئے۔ اشرف انہیں کہانی سناتا رہا اور ساتھ ساتھ عام سے انداز میں تارا کے بالوں سے کھیلتا رہا۔ اس عمر میں ہی تارا کے بال نہایت گھنے اور لمبے تھے۔ تارا کی ساری توجہ اشرف کی کہانی کی طرف تھی اور اشرف کی ساری توجہ تارا کے بالوں کی طرف اور اس کے ہاتھوں کی طرف......... کہانی لڑکھڑا رہی تھی۔ کبھی کہیں پہنچ جاتی' کبھی کسی طرف نکل جاتی۔ سننے والے بار بار ٹوک رہے تھے۔ وہ کہانی کو پھر پٹڑی پر لاتا وہ پھر اتر جاتی۔ اسی اثنا میں اچانک نیچے سے چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ بچوں کو ڈانٹ رہی تھی کہ ان کے ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے' وہ جلدی سے نیچے آئیں۔

بچے بے مزہ ہو کر کہانی کو چھوڑ کر نیچے چلے گئے' بس تارا اس کے پاس بیٹھی رہ گئی۔

اشرف کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ اس سے پہلے کبھی اس طرح نہیں دھڑکا تھا۔ وہ پہلے والی کہانی چھوڑ کر تارا کو ایک نئی انڈین فلم کی کہانی سنانے لگا۔ یہ فلم چار پانچ روز پہلے اس نے ایک چائے خانے پر صرف تین روپے دے کر دیکھی تھی۔ بڑی دھانسو قسم کی فلم تھی۔ دس بارہ گانے تھے۔ اس نے بڑی تفصیل سے فلم کے واقعات سنانے شروع کیے۔ بیچ بیچ میں اس نے تارا کو یہ بھی بتایا کہ یہ بڑی ہٹ فلم ہے۔ آخر تارا نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ ہٹ فلم کیا ہوتی ہے؟"

"تم بھی نری پینڈو ہی ہو' ہٹ فلم اسے کہتے ہیں جو بہت زیادہ پسند کی جائے۔ دیکھنے والے اس پر ٹوٹ پڑیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ تو میں کیا بتا رہا تھا؟ ہاں جب ہیروئن مادھوری پتھروں پر چڑھتے ہوئے لڑکھڑانے لگی تو سنجے دت نے آگے بڑھ کر ایسے اس کا بازو پکڑ لیا۔"

ٹھیک ایکشن بتاتے ہوئے اشرف نے باقاعدہ تارا کا بازو پکڑا' اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" تارا نے بازو چھڑاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

"پھر وہ اوپر ڈاک بنگلے میں آ گئے۔ وہی پتھروں کا بنا ہوا گھر۔ بارش میں دونوں بھیگ گئے تھے اس لئے انہوں نے آگ جلائی۔ وہ دونوں آگ کے قریب ایک دوسرے کے پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ سمجھو کہ یہ آگ ہے اور یہ وہ دونوں کھڑے ہیں۔"

اشرف اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا' اس نے تارا کو بھی اپنے سامنے کھڑا ہونے کو کہا۔ گاہے گاہے وہ کھڑکی سے بھی جھانکتا تھا کہ باہر سے کوئی آ تو نہیں رہا۔ "سنجے دت سیدھا مادھوری کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح مادھوری کے کندھوں پر رکھ دیے۔" اشرف نے کہا اور ہاتھ تارا کے کندھوں پر رکھ دیئے پھر بولا۔

"اس کے بعد باہر بجلی کڑکی۔ گڑ گڑ گڑ۔ اس کے ساتھ ہی سنجے نے کھینچ کر مادھوری کو گلے سے لگا لیا۔"

اس نے تارا کو گلے سے لگایا اور اپنا چہرہ اس کے قریب تر لے گیا۔ "چھوڑو! کیا کرتے ہو۔" تارا نے بیزاری سے کہا اور اشرف کو جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔

تارا کے چہرے پر بیزاری اور جھنجلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔ "پیچھے ہٹو۔ مجھے اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

اشرف کے جسم پر ایک دم اوس سی پڑ گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ میں تو کہانی سنا رہا تھا۔"

"اچھا پیچھے ہٹو۔" اس نے اشرف کو سامنے سے ہٹایا اور نیچے چلی گئی۔

اشرف پتھر کی طرح ساکت اور بے حس اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اگلے دو تین روز اشرف نے عجیب سی شرمندگی کے زیر سایہ گزارے۔ اسے رہ رہ کر تارا پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ تو اس کی کوئی بات ٹالتی نہیں تھی' ہروقت اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا تھا اس کی رائے ہمیشہ اشرف کی رائے کے ساتھ ہی ملا کرتی تھی پھر اس نے اتنی بے رخی سے اشرف کو کیوں جھٹکا؟

وہ کئی دن تک ماموں کے گھر گیا اور نہ ہی اس نے تارا سے بات کی۔ ایک دو بار ممانی نے کسی کام سے بلایا بھی مگر وہ ٹال مٹول کر گیا۔ آخر ایک دن جب وہ چھت پر بیٹھا

پڑھ رہا تھا' تارا آ گئی۔ اس نے اشرف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اوئے! تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں ہو؟"

"بس نہیں بولتا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "دیکھو! میں یہ تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔" اس نے اشرف کی آنکھوں کے سامنے ایک دم مٹھی کھولی۔ اس میں اشرف کی پسندیدہ سونف سپاری کے پیکٹ تھے۔

اشرف نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

اس نے ایک پیکٹ کھولا اور لڑ جھگڑ کر زبردستی کچھ سونف سپاری اشرف کے منہ میں ٹھونس دی۔

اس دن دونوں میں صلح ہو گئی لیکن چند دن پہلے والی بات ابھی تک اشرف کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی اپنی پسندیدہ ایکٹر ارمان کے بارے میں سوچتا تھا۔ تارا کا چہرہ بھی اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اگر ماموں ممانی کو اس کا پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ خاص طور سے اپنے پیارے ماموں کی ناراضگی تو وہ کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا لیکن دوسری طرف اس کی افتاد طبع تھی اور اس کا فطری تجسس تھا جو اسے ہر گھڑی بے چین رکھتا تھا۔ ٹی وی کے ڈرامے' فلمیں اور اخبارات کے رنگ برنگے اشتہارات اس کی بے کلی میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں ارمان کا چہرہ دیکھ لیتا تھا بس دیکھتا چلا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی محرومی اور نارسائی اپنے عروج پر پہنچ جاتی تھی۔

ایک دن وہ پھر ماموں ارشاد کے گھر جا پہنچا۔ سہ پہر کا وقت تھا' ممانی سو رہی تھیں۔ نوکر سبزی کاٹ رہا تھا۔ اتفاقاً گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ تارا اوپر کے کمرے میں بیٹھی اسکول کا کام کر رہی تھی۔ اشرف اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ قریب ہی اخبار کے رنگین فلمی صفحات پڑے تھے۔ فلمی پریوں کی ہوش ربا تصویریں تھیں' لیکن ان میں ارمان کی تصویر کہیں نہیں تھی اس لئے اشرف نے اسے ایک طرف ڈال دیا۔ وہ خبروں والا اخبار پڑھنے لگا۔ بیچ بیچ میں سے وہ تارا کو بھی سنا رہا تھا۔ "یہ "زیادتی" کیا ہوتی ہے؟" تارا نے معصومیت سے پوچھا۔

"سائیڈ ہیرو جب ہیروئن کو تنگ کرتا ہے تو اسے زیادتی کہتے ہیں۔" اشرف نے بتایا۔

"اور مجرمانہ حملہ؟" تارا نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں تو مجھے بھی پتا نہیں۔ جہانگیر سے پوچھوں گا۔ اسے پتا ہو گا' نہیں تو جہانگیر کے یار طوطے کو ضرور پتا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی زیادتی سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔"

"اچھا کوئی دوسری خبر پڑھو۔" تارا نے بیزاری سے کہا۔

اشرف دوسری خبریں پڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر اس کا ایک ہاتھ تارا کے بالوں سے الجھ رہا تھا۔ وہ ظاہر یہی کر رہا تھا جیسے بے خیالی میں ایسا کر رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تارا برا نہیں مانے گی' کیونکہ دو تین دن پہلے ہی اس نے بڑی مشکل سے اشرف کو منایا تھا۔ اب اشرف کے سامنے فلمی اشتہارات کا صفحہ تھا۔ کئی جگہ ہیرو ہیروئن بغل گیر نظر آ رہے تھے۔

ان کے درمیان مارکر سے سیاہ لائن کھینچ دی گئی تھی' مگر دیکھنے والے کے ذہن پر ایسی لائن نہیں کھینچی جا سکتی۔ "یہ دیکھو! جاوید شیخ نے سلمیٰ آغا کو کس طرح گلے سے لگا رکھا ہے۔"

"ہوں۔" تارا نے بیزار لہجے میں ہنکارا بھرا۔

"یہ نیا اسٹائل ہے۔ پہلی فلموں میں پتا ہے کیسے گلے لگاتے تھے؟"

"کیسے؟" اس نے بے دھیانی سے کہا۔

"ایسے۔" اشرف نے بیٹھے بیٹھے تارا کو بانہوں میں لینے کی کوشش کی۔

"اشرفی! کیا کرتے ہو؟ پیچھے ہٹو۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

یہی وقت تھا جب اچانک ممانی دروازے پر نمودار ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت آمیز غضب کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

اشرف ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ تارا بھی خوف زدہ نظر آنے لگی۔ آتے ساتھ ہی ممانی نے ایک زور کا تھپڑ اشرف کے منہ پر مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ بایاں کان شائیں شائیں کرنے لگا تھا۔ ممانی نے بالوں سے پکڑ کر اشرف کو جھنجوڑا اور غراتی آواز میں بولیں۔ "دفع ہو جا یہاں سے۔ نکل جا میرے گھر سے۔

بدمعاش کہیں کا' عمر دیکھو اور کام دیکھو۔"

اشرف کے پاؤں میں صرف ایک جوتی تھی' دوسری ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی دروازے کی طرف بڑھا۔ ممانی نے ایک اور دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں اترا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا' کب نیچے پہنچ گیا۔ اس کا بایاں گال ابھی تک سنسنا رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

ساری رات اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہا۔ گاہے گاہے آنکھوں سے گرم آنسو بہنے لگتے تھے۔ وہ خود کو کوس رہا تھا' اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس سے ایسا کیوں ہوا؟ جب وہ جانتا تھا کہ یہ باتیں ٹھیک نہیں تو پھر وہ کیوں باز نہ رہ سکا؟ اس کے ساتھ ہی پیش آمدہ اندیشے اسے گھیر لیتے تھے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ کیا ممانی یہ بات ماموں تک پہنچائیں گی؟ ماموں کیا کریں گے؟ کیا یہ بات امی جان اور عارفہ تک پہنچے گی؟ اگر پہنچے گی تو پھر اس کا حشر کیا ہو گا؟

وہ روتا رہا اور رو رو کر خدا سے معافی مانگتا رہا۔ "اے میرے مالک! اس مرتبہ۔ صرف اس مرتبہ مجھے معافی دلا دے۔ آئندہ مر کر بھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔ کوئی فلم نہیں دیکھوں گا' کوئی ڈراما نہیں دیکھوں گا۔ جہانگیر اور طوطے کی دوستی بھی چھوڑ دوں گا۔ وہی سب کچھ کروں گا جو ابا جان کہا کرتے ہیں۔"

جاگتے جاگتے جب اسے اونگھ سی آتی تو خیال میں ایک بار پھر ممانی کی غضب ناک آنکھیں آ جاتیں۔ وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔

صبح اس نے ڈرتے ڈرتے سب کے چہرے دیکھے۔ چہرے نارمل ہی تھے۔ صحن میں وہ ایک جوتی بھی پڑی تھی جو ممانی کے گھر سے بھاگتے ہوئے وہاں رہ گئی تھی۔ اسے تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن ماموں ارشاد اس کے گھر آئے اور اسے اپنے ساتھ قریب ہی واقع چلڈرن پارک میں لے گئے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اشرف کو وہاں ہوا خوری کے لئے لے جاتے تھے۔ بچپن سے ہی ماموں کو اشرف سے بڑا پیار تھا۔

چلڈرن پارک میں جا کر ماموں نے بڑے دھیمے لہجے میں اشرف کو سمجھانا شروع کیا۔ ان کی طویل گفتگو کا آغاز اس فقرے سے ہوا۔ "اشرفی! تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔" باقی کی

گفتگو میں انہوں نے اشرف کو وہ سب کچھ سمجھایا جو ہمدرد بزرگ کی حیثیت سے انہیں سمجھانا چاہئے تھا۔ انہوں نے اشرف سے کہا کہ وہ سویرے اٹھا کرے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھے۔ پڑھائی میں دلچسپی لے اور بیکار قسم کے لڑکوں کی دوستی چھوڑ دے۔ اشرف بس بیمار بکرے کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ ندامت کے بوجھ سے اس کی پلکیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

اس روز ماموں کے سمجھانے کے بعد' دو تین ہفتے تو ٹھیک گزرے' اس کے بعد دھیرے دھیرے پھر وہی پرانی مصروفیات اشرف کی زندگی میں داخل ہونے لگیں۔ ارمان کی فلمیں تو ایک نشے کی طرح تھیں جن سے وہ کسی طور چھٹکارا پا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ فلمیں اور دیگر واہیاتیات ایک نادیدہ جال کی طرح اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ان سے کہاں تک بچتا' اور پھر جہانگیر' طوطے جیسے دوست تھے جو اسکول اور گھر' غرض ہر جگہ اس کی زندگی میں مداخلت کر رہے تھے۔

جہانگیر چند ہفتے کے وقفے کے بعد اب پھر اشرف کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ اس کی نئی نویلی بھابی نشاط بھی ہوتی تھیں۔ نشاط کی دوستی اشرف کی آپا عارفہ سے ہو گئی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہتیں' اس دوران میں اشرف اور جہانگیر دوسری منزل کے برآمدے میں ٹینس بال پر ٹیپ چڑھا کر کرکٹ کھیلتے یا باتیں کرتے۔ ایک دو بار آپا عارفہ اور جہانگیر کی بھابی نشاط بھی کھیل میں شریک ہوئیں۔ نشاط بھرے بھرے جسم کی خوب صورت لڑکی تھی۔ اوپر سے نئی نئی شادی ہوئی تھی' وہ لباس بھی بڑے شوخ اور طرح دار پہنتی تھی۔ اشرف اسے چلتے پھرتے اور تیزی سے سیڑھیاں اترتے دیکھتا تو اسے اپنے سینے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوتی۔

جہانگیر کی بھابی نشاط کو ہاتھ دکھانے اور دیکھنے میں بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن وہ اوپری منزل کے برآمدے میں بیٹھی آپا عارفہ کا ہاتھ دیکھ رہی تھی' اشرف قریب سے گزرا تو آپا نے آواز دے کر اسے بلا لیا۔ "ادھر آ لنڈورے! باجی کو ہاتھ دکھا۔ پتا چلے کہ تیری قسمت میں بھی کچھ پڑھائی لکھائی ہے یا نہیں۔"

اشرف نے انکار کیا تو آپا اسے کان سے کھینچ کر نشاط کے پاس لے گئیں۔ "چل بیٹھ ادھر۔" انہوں نے تحکم سے کہا۔

"ہائے ہائے چھوڑ اس کا کان! کوئی بچہ تو نہیں ہے۔" نشاط نے مداخلت کرتے ہوئے

آپا سے اس کا کان چھڑایا۔

اشرف کا ہاتھ نشاط کے ہاتھ میں آیا تو اشرف کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ نرم ملائم ہتھیلی۔ گداز اور حرارت کا دل نشیں امتزاج۔ کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں۔ گلابی زمین اور سفید پھولوں والا ویلوٹ کا چمکتا سوٹ۔ ایک مدھر خوشبو اشرف کے نتھنوں سے ٹکرائی اور پورے جسم میں بکھر گئی۔ نشاط اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کی ہتھیلی پر پھیرتی رہی اور لکیروں کا حساب کتاب بتاتی رہی۔ "یہ دل کی لکیر ہے' یہ علم کی' یہ عمر کی۔ یہ روپے کی۔"

اس کی حنائی انگلی اشرف کی ہتھیلی پر میٹھی میٹھی گدگدی کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ "اشرف' تمہاری شادی کی لکیر بڑی ٹیڑھی ہے۔ خیر چھوڑو۔ یہ دیکھو یہ زحل کے ابھار......... کے نیچے جو چھوٹی چھوٹی لائنیں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھو گے اس کے علاوہ تمہارے اندر جستجو بہت ہے۔ تم چیزوں کو کھوجنا چاہتے ہو۔ ان کی تہہ تک پہنچنے کی فوری خواہش تمہارے اندر بڑی تیزی سے جاگتی ہے۔"

اشرف نے دل ہی دل میں کہا۔ "تم کہتی تو ٹھیک ہو۔ واقعی ہر نئی چیز کو کھوجنا چاہتا ہوں' جیسے تم ہو۔ تمہارے اندر جھانکنے کا خواہش مند ہوں' لیکن تم مجھ سے بہت دور ہو اور یہ دوری مجھے اور الجھاتی ہے۔"

نشاط کہہ رہی تھی۔ "اگر ایسے لوگ اپنے تجسّس کو علم حاصل کرنے میں استعمال کریں تو بڑی جلدی بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ تم خوب دل لگا کر پڑھو۔ تمہارے جیسے لوگ ہی نیوٹن' آرشمیدس اور البیرونی بنتے ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔"

نشاط کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اشرف کو مسحور کئے دے رہی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک ایک رس بھرے نغمے کی طرح تھی۔

اس دن کے بعد نشاط کے ساتھ اشرف کی اکثر گپ شپ رہنے لگی۔ پامسٹری وغیرہ سے اشرف کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی مگر اسے نشاط میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی لہٰذا اس نے ہاتھ کی لکیروں کو اہمیت دینا شروع کر دی۔ کبھی نشاط سے اس کا سامنا ہوتا تو وہ ان لکیروں کو لے کر بیٹھ جاتا۔ "یہ دیکھو باجی! یہ انگوٹھے کے ساتھ آپ نے بتایا تھا کہ زندگی

کا خط ہے' اس کے ساتھ ہی یہ دوسری لائن کون سی ہے؟"

"اسے خط مریخ کہتے ہیں۔"

"مگر میرے ہاتھ میں یہ خط درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" باجی اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہتی۔

اشرف کا اصل مقصد نشاط کو اپنا ہاتھ تھمانا ہی ہوتا تھا۔ جب وہ ہاتھ تھام لیتی اور اس کی حنائی انگلی کی پور اشرف کی ہتھیلی پر گدگدی شروع کر دیتی تو وہ بات کو طول دینے کی کوشش کرتا۔ "یہ دیکھیں۔ اس لائن کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ یہ دل کی ہے اور اگر یہ زحل کے ابھار کے نیچے دماغ کی لکیر کو چھو رہی ہو تو یہ عجیب و غریب قسم کی سوچوں کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ دیکھیں یہاں یہ لکیر دماغ کی لکیر کو چھو رہی ہے۔"

"بھئی چھو نہیں رہی' یہ دیکھو یہاں خط وجدان سے آگے یہ ٹوٹی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔"

اس قسم کی باتوں سے اشرف کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا' وہ زیادہ سے زیادہ دیر نشاط کے پاس بیٹھے اور اس کا ہاتھ نشاط کے ہاتھ میں رہے۔ تارا کے حوالے سے اسے جو صدمہ پہنچا تھا شاید اسی کے ازالے کے لئے وہ خوب رو نشاط کے خیالوں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ گاہے گاہے اسے تارا کا خیال بھی شدت سے آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ممانی کی آتش بار سرخ آنکھیں اس کے تصور میں چمک جاتی تھیں۔ ایسے میں اس کا بایاں گال ایک طمانچے کے ذائقے کو محسوس کرتا تھا اور اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا۔ اس نے ایک دو دفعہ تارا کو دیکھا تھا' وہ اس سے دور دور رہتی تھی اور بات بھی کم کرتی تھی۔ یقیناً ایسا ممانی کی ہدایت پر ہی تھا۔ گھر میں آکر ایک قاری صاحب تارا کو سپارہ پڑھانے لگے تھے اور اوڑھنی مضبوطی سے اس کے سر اور کانوں کو ڈھانپے رہتی تھی۔

ایک دن نشاط نے اشرف کی آپا سے کہا۔ "عارفہ! اشرف پر بس تھوڑی سی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ پڑھائی میں ایک دم ٹھیک ہو سکتا ہے۔ امتحانوں میں ابھی تین چار مہینے ہیں' یہ تھوڑی سی محنت کر لے تو بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو سکتا ہے۔"

عارفہ نے کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے' مگر یہ کہیں ٹک کر بیٹھے تب ہے نا۔"

"تم ایسا کرو شام چار بجے کے بعد اسے میرے پاس بھیج دیا کرو۔ میں اسے ایک دم سیدھا کر دوں گی۔"

عارفہ کو اکثر اشرف کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ وہ خود بھی بی ایس سی کی تیاری کر رہی تھی۔ لہٰذا اسے وقت نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے فوراً نشاط کی آفر قبول کر لی۔ اشرف چار بجے کے بعد جہانگیر کی بھابی نشاط سے پڑھنے جانے لگا۔ وہ واقعی بڑی دلچسپی اور محبت سے پڑھاتی تھی۔ ایک ایک لفظ اشرف کے ذہن میں اتر جاتا تھا۔ اگر اس کی توجہ صرف پڑھائی پر ہوتی تو شاید وہ اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا لیکن اس کی زیادہ توجہ تو پڑھانے والی پر تھی۔ نشاط کا قرب اسے مدہوش سا کر دیتا۔ اس کے بدن پر خفیف لرزش طاری ہو جاتی اور حلق خشک ہونے لگتا۔ نشاط اسے بڑی ملائمت اور محبت سے اشرفی کہہ کر بلاتی تھی۔ وہ اس کے لہجے کو نئے نئے معنی پہناتا اور کسی وقت اسے شک ہوتا تھا کہ شاید نشاط اس ساری ہلچل سے واقف ہے جو نشاط کے قریب ہوتے ہوئے اس کے دل میں مچی رہتی ہے۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ نشاط نے اشرف کو چور نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پایا اور مصنوعی غصے سے کہا۔ "اشرفی! اپنی کتاب کی طرف دھیان رکھو۔"

نشاط کا دیور اور اشرف کا دوست جہانگیر ان دنوں اپنی دادی ماں کے پاس کراچی گیا ہوا تھا۔ اس کی دادی بیمار تھیں اور انہوں نے جہانگیر کو بلوایا تھا اشرف اکثر سوچتا تھا کہ اگر جہانگیر بھی یہاں موجود ہوتا تو شاید اسے اتنی اتنی دیر نشاط کے پاس تنہا بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔

انہی دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے اشرف کے دل میں مچی ہوئی ہلچل کو شدت دے دی۔ اشرف نشاط کے گھر میں پڑھ رہا تھا۔ اس کا آٹھویں کا امتحان اب بس ڈیڑھ دو ماہ کی دوری پر تھا۔ اکثر وہ آٹھ نو بجے تک نشاط کے گھر ہی رہتا تھا۔ نشاط کو اپنے خاوند یعنی جہانگیر کے بھائی جان کے ساتھ کہیں باہر جانا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی۔ جلدی میں اس کے بالوں کا کلپ کچھ اس طرح بالوں میں الجھا کہ بس پھنس کر رہ گیا۔ نشاط نے چھوٹی ملازمہ بچی کو مدد کے لئے پکارا' اس نے بھی کوشش کی مگر کلپ نہیں نکلا۔ اشرف نے دیکھا تو اٹھ کر نشاط کی مدد کو پہنچ گیا۔ دندانے دار کلپ کو نکالنا واقعی مشکل ثابت ہوا اس دوران میں اشرف کے ہاتھ نشاط کے ریشمی سیاہ بالوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ نشاط کے ہونٹوں سے بار بار سسکاری نکل جاتی تھی! "اشرفی! دھیان سے' اف.......... ہائے۔"

نشاط کو تکلیف سے بچانے کے لئے اشرف نے بالوں کے نچلے حصے کو اس طرح تھاما کہ کلپ نکالنے کے لئے جن جھٹکوں کی ضرورت تھی ان کا اثر بالوں کی جڑوں تک نہ

پہنچے۔ یوں دو تین منٹ کی کوشش سے اس نے کلپ باہر کھینچ لیا۔ نشاط سٹپٹائی ہوئی تھی' اسے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی' اب اور دیر ہو گئی تھی۔ جلدی میں اکثر کام الٹے ہوتے ہیں۔ نشاط کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب اس کے شوہر صاحب نے نیچے گلی میں آکر موٹر سائیکل کا ہارن بجانا شروع کیا' وہ اندر کمرے میں کپڑے بدل رہی تھی۔ وہ اندر ہی سے آواز دے کر بولی۔ ''اشرفی! اپنے بھائی جان سے کہو۔ بس دو منٹ رکو میں آرہی ہوں۔''

اشرف نے دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ گلی میں بھائی جان اسٹارٹ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے تھے اور جھلائے ہوئے تھے۔ اشرف نے کہا۔ ''بھائی جان! وہ کہہ رہی ہیں' صرف دو منٹ ٹھہریں۔ میں تیار ہوں بس نکل رہی ہوں۔''

اشرف واپس کمرے میں آیا تو نشاط ساٹن کا خوب صورت آسمانی سوٹ پہن کر بالوں کو جُوڑے کی شکل میں باندھ چکی تھی۔ پورا کمرا اس پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا جو اس نے لگایا تھا۔ اشرف اس کے قیامت بدن کو چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی مگن تھی کہ اس کی چوری پکڑ نہیں سکتی تھی۔ جلدی سے لپ اسٹک لگا کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑے۔ جیسے کمر کھجانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ کمر نہیں کھجا رہی تھی' کچھ اور کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ جھلا کر کرسی پر بیٹھ گئی اور ذرا سا آگے کو جھک گئی۔ ''اشرفی! یہ میری قمیض کی زپ بند کرو ذرا۔''

اشرف کا دل جیسے ایک دم ہی حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ ریشمی بالوں کے جُوڑے کے نیچے نشاط کی ریشمی جلد اس کے سامنے تھی۔ جلدی میں کلپ کی طرح زپ بھی الجھ گئی تھی۔ اسے سلجھانے کی ضرورت تھی' اشرف تو خود الجھا ہوا تھا اسے کیا سلجھاتا۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ پتا نہیں کس طرح زپ بند کرنے میں کامیاب ہوا۔ نشاط جلدی سے چادر لیتی ہوئی اور ہینڈ بیگ سنبھالتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ اشرف وہیں پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی انگلیوں کی پوریں جیسے ابھی تک کسی گداز ریشم میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز اس نے اپنے ایک دوست کے گھر وڈیو پر ارمان کی ایک نئی فلم دیکھی۔ اس فلم میں ارمان نے بڑے ہوش ربا رقص کئے تھے۔ کئی لوگ تو صرف ارمان کے ڈانس کے لئے یہ فلم دیکھ رہے تھے۔ جو کام اکثر فلموں میں بارش اور پانی سے لیا جاتا ہے وہ اس فلم میں تیز ہوا سے لیا گیا تھا۔ ایک مہین باریک سی ساڑی پہنے ارمان نے تند و تیز ہوا میں ایک بدمست گانا گایا تھا۔ اس گانے کو دیکھ دیکھ کر ناظرین لوٹ پوٹ ہو رہے

تھے۔ اشرف نے بھی اس گانے کو اضافی دلچسپی سے دیکھا۔ جب وہ یہ گانا دیکھ رہا تھا نہ جانے کیوں ارمان کے تھرکتے مچلتے جسم پر سے اس کا چہرہ اوجھل ہو گیا اور وہاں نشاط کا چہرہ سج گیا۔ اس نے ٹی وی اسکرین پر ارمان کے بجائے نشاط کو توبہ شکن انگڑائیاں لیتے دیکھا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں میں ایک ریشمی لمس کی پیاس جاگنے لگی۔

آنے والے چند دنوں میں نشاط اس بری طرح اشرف کے ذہن پر سوار ہوئی کہ ہر طرف بس وہی وہ نظر آنے لگی۔ نشاط کے شوہر یعنی جہانگیر کے بھائی جان اپنے دفتری کام کے سلسلے میں پورے ایک مہینے کے لئے مانسہرہ چلے گئے تھے۔ نشاط کے پاس اشرف کو پڑھانے کے لئے اب زیادہ ٹائم ہوتا تھا اور وہ امتحانات کے پیش نظر اس پر توجہ بھی زیادہ دے رہی تھی لیکن اشرف کے ذہن میں تو کوئی چیز تب گھستی جب وہاں کوئی جگہ ہوتی' ادھر تو اور بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اشرف کا دل گواہی دیتا تھا کہ نشاط' اس کے دل میں ہونے والی کھد بد سے آگاہ ہے۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے ایک پاکستانی فلم دیکھی تھی۔ اس میں اشرف ہی کی عمر کا ایک لڑکا اپنے سے کئی سال بڑی حسینہ سے پیار کرتا ہے۔ یہ ان دونوں کے پیار ہی کی کہانی تھی۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد اشرف کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ مرد عورت میں اس قسم کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ فلم اشرف نے طوطے کے ساتھ دیکھی تھی۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد منٹو پارک میں گھومتے ہوئے طوطے نے اشرف کو ایک دو مزید ایسے واقعات بتائے تھے جن سے اشرف کو پتا چلا تھا کہ پیار میں دولت اور شکل و صورت کی طرح عمر کا فرق بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

چند دن بعد اشرف کو اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک شادی میں اپنے آبائی گاؤں ''رنگی'' جانا تھا۔ وہاں ان کا پانچ چھ دن رہنا ضروری تھا۔ شروع میں تو امی اور آپا کا خیال تھا کہ اشرف کو لے جایا ہی نہ جائے کیونکہ اس کے امتحان قریب آرہے تھے مگر پھر آخری فیصلہ اشرف کو ساتھ لے جانے کے حق میں ہوا تھا۔ آپا نے کہا تھا کہ اشرف کتابیں ساتھ لے جائے گا اور وہاں پڑھتا رہے گا۔ اشرف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنے دن نشاط سے دور رہ کر کیسے گزارے گا۔ نشاط کو دیکھنا جیسے اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ اب وہ کسی وقت تارا کے بارے میں سوچتا تھا تو وہ اسے کوئی دور کی چیز نظر آتی تھی اور اس کے بارے میں اپنی حماقتیں یاد کر کے وہ شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ ایک روز وہ نشاط کے گھر پہنچا تو وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ گاہے

گاہے اس کی نظر نشاط کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ چھوٹی ملازمہ لڑکی "ننھی" گھر میں موجود نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جہانگیر کی والدہ بھی کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ نشاط بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر اشرف کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر بلی کی چال چلتا کمرے میں آگیا۔ وہ اس کے بے ترتیب جسم کو دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں جیسے چاند کے چہرے پر بادل کی لہریں سی آگئی ہوں۔ اس کی اوڑھنی پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی آہستہ سے واپس پلنگ پر رکھ دی۔ اس کی بوجھل سانسوں کی آواز اشرف کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اشرف بالکل قریب سے اسے دیکھنے لگا پھر نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ نے اچانک حرکت کی اور بڑی آہستگی سے نشاط کے رخسار پر آگیا۔ اس کی انگلیوں کی جلتی ہوئی پوریں بڑی ملائمت سے نشاط کے ریشمی ملائم رخسار پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ اس دلگداز لمس کو اپنی انگلیوں کے راستے اپنے دل میں اتارنے لگا پھر اس نے دوسرے رخسار کو چھوا۔ اس کی نرمی اور گرمی کو پوری وضاحت کے ساتھ محسوس کیا۔ یہ ایک حد تھی۔ وہ اس سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ وہ جاگ جاتی۔

دل اس کے سینے میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ وہ اسے سنبھالتا ہوا واپس برآمدے میں اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس رات اپنے گھر جا کر اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس نے لاہور آکر کسی سے سنا تھا کہ عشق محبت کے معاملوں میں پہل اکثر مرد کو ہی کرنی پڑتی ہے ورنہ یہ معاملے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ نشاط کے ساتھ اپنے "معاملے" کو ادھورے پن سے بچانے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے خط لکھے گا۔ ایسا خط جس میں پوری سچائی اور دلیری کے ساتھ اپنے دل کا سارا حال نشاط سے کہہ ڈالے گا۔ بالکل جیسے دور درشن کے ڈرامے پہلی محبت میں نو عمر ہیرو نے اپنی محبوبہ سے کہا تھا۔

اس نے رات کو بیٹھ کر ایک خط لکھا۔ "نشاط صاحبہ۔ سچ، سچ ہوتا ہے اور جھوٹ جھوٹ.......... میں جانتا ہوں کہ میں آپ سے چھوٹا ہوں اور جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، یہ مجھے نہیں لکھنا چاہئے لیکن سیانے سچ کہتے ہیں، دل پر کسی کا زور نہیں ہوتا۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں، اتنا زیادہ پیار کہ شاید آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ میری زندگی میں آپ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آپ مجھے پڑھانا

چاہتی ہیں مگر میرا دل پڑھائی میں بالکل بھی نہیں لگتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ کاش آپ کی شادی نہ ہوئی ہوتی۔ میں آپ کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاتا۔" اس سے آگے اشرف نے ڈش پر دیکھے ہوئے ٹی وی ڈرامے "پہلی محبت" کے ہی دو ڈائیلاگ لکھ دیئے تھے۔

اس نے لکھا تھا۔ "نشاط! محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ اس کا کوئی ملک ہوتا ہے نہ مذہب اور نہ عمر۔ اکثر یہ وہیں پر ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہئے۔"

ان آخری دو جملوں کی پوری سمجھ تو اسے نہیں آئی تھی مگر یہ جملے اسے اچھے لگے تھے چونکہ یہ جہانگیر اور طوطے کو بھی اچھے لگے تھے اس لئے اشرف نے یہ خط میں لکھ ڈالے۔ لکھنے کے بعد اس نے خط کو پڑھا تو لفظ اور فقرے ذرا بھاری بھاری لگے، مگر اس نے سوچا جو لکھ دیا سو لکھ دیا۔ نشاط نے کون سا اس کے سامنے یہ خط پڑھنا تھا۔ بلکہ اشرف کی تو پلاننگ ہی اور تھی۔ اس نے یہ خط نشاط کو کل سہ پہر دینا تھا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو گاؤں جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن روانہ ہو جانا تھا۔ وہاں سے اشرف کی واپسی پانچ چھ روز بعد ہی ہونا تھی۔ لہٰذا امکان نہیں تھا کہ خط دینے کے فوراً بعد اشرف کو کسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت وہ نشاط کے گھر گیا۔ نشاط یہی سمجھی کہ وہ اسے گاؤں جانے سے پہلے خدا حافظ کہنے آیا ہے۔ وہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ چاول لینے کے لئے ایک منٹ کے لئے اسٹور روم میں گئی تو اشرف نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط اس پرات میں رکھ دیا جس میں ماش اور چنے کی دال تھی۔ نشاط یہ دال چنتے چنتے اسٹور میں گئی تھی۔ خط رکھ کر اشرف تیزی سے سیڑھیاں اترا اور واپس اپنے گھر آگیا۔ امی جان ابا جان آپا اور دیگر افراد سامان باندھے بالکل تیار بیٹھے تھے، فقط اشرف کا انتظار تھا۔ سامان ٹیکسی میں رکھا جا چکا تھا۔ جونہی اشرف آیا سب لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے.......... مگر ٹیکسی نے چلنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس کا پہیا پنکچر ہو چکا تھا۔

اب پہیا بدلنے میں آٹھ دس منٹ تو لگ ہی جانے تھے۔ ابا جان گھر کے اندر چلے گئے اور اخبار پڑھنے لگے، اشرف بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ نشاط چادر لئے تیز قدموں سے اسی کی طرف چلی آرہی ہے۔ اس کے آنے کا انداز "حوصلہ افزا" ہرگز نہیں تھا۔ ایک لمحے کے

لئے تو اشرف کے دل میں آئی کہ کھسک جائے مگر گھر والے ارد گرد موجود تھے۔

اشرف کے قریب پہنچ کر نشاط نے کہا۔ "اشرفی! میرے ساتھ آؤ' میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کا لہجہ نارمل ہی تھا اشرف کچھ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ غصے میں ہے یا نہیں۔

اشرف نے ہکلا کر کہا۔ "ہم جا رہے تھے............"

"کوئی بات نہیں' ابھی گاڑی چلنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے پڑے ہیں۔"

امی نے بھی کہا۔ "جاؤ سن آؤ بات۔"

اشرف مرے مرے انداز میں نشاط کے ساتھ چلتا ہوا ان کے گھر پہنچا۔ نشاط اسے لے کر ایک کمرے گھس گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چادر اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"اشرفی! یہ خط تم نے لکھا ہے؟" اس نے خط اشرف کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

اس کے تاثرات نے اشرف کو ڈرا دیا۔ اس نے تھوک نگلا۔ وہ غراتی آواز میں بولی۔ "اشرفی! میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے' یہ خط تم نے لکھا ہے؟؟"

"نن۔ نہیں۔" وہ ڈر کر مکر گیا مگر اس کے انکار کا انداز ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اقرار کر رہا ہے۔

نشاط نے ایک بار پھر خط اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھٹی ہوئی آواز میں بولی "اشرفی! یہ خط تم نے لکھا ہے اور مجھے لکھا ہے۔ مجھے لکھا ہے۔ کمینے کتے بد خصلت!؟" اس کے ساتھ ہی ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی اس کے ہاتھ آ گئی۔ وہ مضبوط لکڑی کی ڈوئی بے دریغ اس کے جسم پر برسانے لگی' ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی "بے غیرت تجھے شرم نہ آئی۔ تیری آپا سے ایک سال بڑی ہوں میں۔ میرے بارے میں۔ میرے بارے میں تُو نے ایسے گندے انداز سے سوچا۔ کمینے............پاجی!؟"

وہ چیختی جا رہی تھی اور اسے مارتی جا رہی تھی۔ ڈوئی ٹوٹ گئی۔ اس نے اشرف کے سینے پر دوہتڑ مارا اور دروازہ کھول کر اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں تک لڑھک گیا۔ یہ دیکھ کر اشرف کا خون بالکل ہی خشک ہو گیا کہ سیڑھیوں کے دوسرے سرے پر ابا جان کھڑے ہیں۔ درحقیقت تھوڑی دیر پہلے وہ نشاط کی آمد کا انداز دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے اور ان کے پیچھے ہی پیچھے یہاں چلے آئے تھے۔

اشرف کے والد صاحب کو دیکھ کر نشاط ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یقیناً وہ رو رہی تھی۔

☆========☆========☆

بعد ازاں نشاط نے اشرف کے کرتوت چھپانے کی کوشش کی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اشرف کے والد صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور شاید تھوڑا بہت کانوں سے بھی سن لیا تھا۔ اگلے دن صبح تک دونوں گھرانوں کو یہ ساری کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ نشاط سے تو جو ٹھکائی ہوئی سو ہوئی' اگلے دن ابا جان نے بھی کمرے میں بند کر کے اس کی خوب خبر لی۔ ان کے جوتے کی ایڑی نے اشرف کے سر پر کئی جگہ "روبڑے" ڈال دیئے۔ اس کے داہنے انگوٹھے پر بھی شدید ضرب آئی۔ دراصل یہ چوٹ کل کی مار کٹائی میں ہی لگ گئی تھی۔ ڈوئی کی ضرب اپنے ہاتھ پر روکنے کی کوشش میں اشرف کا انگوٹھا بری طرح ٹھک گیا تھا۔ دوسرے دن جب ابا جان سے مار پڑی تو انگوٹھے پر پھر چوٹ لگی اور یہ تقریباً ٹوٹ ہی گیا۔

گاؤں جانے کا پروگرام دو دن کے لئے ملتوی ہو گیا تھا۔ رات کو اشرف نے ابا جان اور ماموں کو بند کمرے میں باتیں کرتے سنا۔ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ "بھائی جان! غلطیاں بڑوں میں بھی ہیں۔ ایک طرف ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق چلیں۔ دوسری طرف ہم انہیں اسلام والا ماحول بھی نہیں دیتے۔ ہم اسلام کی بس ان باتوں پر عمل کرتے ہیں جو ہماری مرضی کے مطابق ہوں۔ اب دیکھیں ساتھ والے حاجی برکات کے بڑے بیٹے کی عمر تیس سے کم نہیں ہے لیکن انہوں نے اس کی شادی نہیں کی۔" غم و غصے کا چڑھا ہوا دریا کچھ اترا تو دوسرے روز شام کو ابا جان نے اسے کمرے میں بٹھا کر قریباً دو گھنٹے لیکچر دیا۔ اس لیکچر کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ اس کے لئے سدھرنے کا آخری موقع ہے۔ اگر وہ سدھر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔ اشرف بس روتا رہا اور اقرار میں سر ہلاتا رہا۔

اس دن امی بھی اسے گلے سے لگا کر دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔ وہ درد بھرے لہجے میں بولیں۔ "وے اشرفی! گاؤں میں تو سارے تیری مثالیں دیا کرتے تھے' یہاں آ کر تُو کیا بن گیا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کچھ دن پہلے تُو نے کسی ایسی ہی بات پر اپنی مامی بلقیس کو بھی سخت ناراض کیا ہے۔ تُو کیوں کر رہا ہے ایسا۔ تُو تو نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ اپنے بہن

اشرف کے والد صاحب کو دیکھ کر نشاط ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یقیناً وہ رو رہی تھی۔

☆========☆========☆

بعد ازاں نشاط نے اشرف کے کرتوت چھپانے کی کوشش کی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اشرف کے والد صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور شاید تھوڑا بہت کانوں سے بھی سن لیا تھا۔ اگلے دن صبح تک دونوں گھرانوں کو یہ ساری کی ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ نشاط سے تو جو ٹھکائی ہوئی سو ہوئی' اگلے دن ابا جان نے بھی کمرے میں بند کر کے اس کی خوب خبر لی۔ ان کے جوتے کی ایڑی نے اشرف کے سر پر کئی جگہ "روبڑے" ڈال دیئے۔ اس کے داہنے انگوٹھے پر بھی شدید ضرب آئی۔ دراصل یہ چوٹ کل کی مار کٹائی میں ہی لگ گئی تھی۔ ڈوئی کی ضرب اپنے ہاتھ پر روکنے کی کوشش میں اشرف کا انگوٹھا بری طرح ٹھک گیا تھا۔ دوسرے دن جب ابا جان سے مار پڑی تو انگوٹھے پر پھر چوٹ لگی اور یہ تقریباً ٹوٹ ہی گیا۔

گاؤں جانے کا پروگرام دو دن کے لئے ملتوی ہو گیا تھا۔ رات کو اشرف نے ابا جان اور ماموں کو بند کمرے میں باتیں کرتے سنا۔ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ "بھائی جان! غلطیاں بڑوں میں بھی ہیں۔ ایک طرف ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق چلیں۔ دوسری طرف ہم انہیں اسلام والا ماحول بھی نہیں دیتے۔ ہم اسلام کی بس ان باتوں پر عمل کرتے ہیں جو ہماری مرضی کے مطابق ہوں۔ اب دیکھیں ساتھ والے حاجی برکات کے بڑے بیٹے کی عمر تیس سے کم نہیں ہے لیکن انہوں نے اس کی شادی نہیں کی۔" غم و غصے کا چڑھا ہوا دریا کچھ اترا تو دوسرے روز شام کو ابا جان نے اسے کمرے میں بٹھا کر قریباً دو گھنٹے لیکچر دیا۔ اس لیکچر کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ اس کے لئے سدھرنے کا آخری موقع ہے۔ اگر وہ سدھر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔ اشرف بس روتا رہا اور اقرار میں سر ہلاتا رہا۔

اس دن امی بھی اسے گلے سے لگا کر دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔ وہ درد بھرے لہجے میں بولیں۔ "وے اشرفی! گاؤں میں تو سارے تیری مثالیں دیا کرتے تھے' یہاں آ کر تُو کیا بن گیا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ کچھ دن پہلے تُو نے کسی ایسی ہی بات پر اپنی مامی بلقیس کو بھی سخت ناراض کیا ہے۔ تُو کیوں کر رہا ہے ایسا۔ تُو تو نیک ماں باپ کی اولاد ہے۔ اپنے بہن

بھائیوں کو دیکھ۔ اپنے بڑوں کو دیکھ۔"

اشرف بس سر جھکا کر بیٹھا رہا اور آنکھیں پونچھتا رہا۔ اس کی گردن پر جیسے کسی نے شرم کی ایک بہت بھاری گٹھڑی رکھ دی تھی۔

امی کی نگاہ اس کے زخمی انگوٹھے پر پڑی تو کئی اور موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ انہوں نے اس کے انگوٹھے کو چوما اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔ "تجھے پتا ہے تیرے ابا غصے کے کتنے تیز ہیں۔ اب ایسا کچھ نہ کرنا جس سے تیری ماں مرنے والی ہو جائے.......... اور چل میرے ساتھ ابھی اسی وقت.......... چل کر نشاط سے معافی مانگ۔"

اس رات اشرف کو نشاط سے معافی مانگنی پڑی۔ اگلے روز سہ پہر کے وقت وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ گاؤں چلا گیا۔

☆=========☆=========☆

گاؤں سے واپسی میں تین چار دن لگ گئے۔ اشرف نے بال چھوٹے کرا لئے تھے۔ فلمیں نہ دیکھنے کا عہد کر لیا تھا اور گھر والوں کے سامنے نماز بھی پڑھ لیتا تھا۔ اس کا انگوٹھا اور ہتھیلی کا کچھ حصہ بدستور پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔ رات کو کسی وقت شدید درد ہونے لگتا تھا۔ لاہور واپس آ کر اشرف کے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس کا ایکسرے بھی کروایا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ انگوٹھے کی ہڈی میں فریکچر ہے' تھوڑا سا وقت لگے گا لیکن خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

امی کو بڑی فکر تھی' یہی ہاتھ لکھنے والا تھا اور امتحان بھی قریب آ رہے تھے۔ ایک دن نشاط ان کے گھر آئی۔ وہ اشرف کی تیمارداری کرنے آئی تھی' مگر اس کی آمد کی خبر سن کر اشرف گھر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ دو گھنٹے بعد واپس آیا تو نشاط جا چکی تھی۔ امی نے اسے بتایا کہ نشاط ایک بڑے اچھے پہلوان کا پتا بتا کر گئی ہے۔ دو مہینے پہلے اس کی والدہ کی کلائی ٹوٹی تھی تو اسی پہلوان سے آرام آیا تھا۔

اگلے روز اشرف کی امی بہت اصرار کے ساتھ اشرف کو اس پہلوان کے پاس لے گئیں۔ وہ شاہی قلعے کے قریب ایک گنجان بازار میں بیٹھتا تھا اور اسے خلیفہ رمضان کہا جاتا تھا۔ خلیفہ رمضان نے اشرف کا انگوٹھا دیکھا اور بڑی اچھی طرح پٹی باندھ دی۔ اس نے اشرف کو بتایا کہ اسے ہر دوسرے روز پٹی کے لئے آنا پڑے گا۔

اشرف نے امتحان کی تیاری کے لئے ایک ٹیوشن سینٹر میں جانا شروع کر دیا تھا۔ روز و شب میں ایک تبدیلی سی آگئی تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا امتحان بھی ہو گیا۔ امتحانات کے بعد فراغت ہی فراغت تھی۔ ایک بار پھر دوستوں سے تھوڑا بہت میل ملاپ شروع ہو گیا۔ خیر سے جہانگیر بھی کراچی سے واپس آگیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد یہاں کیا ہوا ہے۔

جہانگیر کی صحبت ہمیشہ سے اشرف کے فکر و عمل میں تبدیلی لاتی تھی۔ عموماً یہ تبدیلی منفی ہی ہوتی تھی۔ فلم دیکھے ہوئے قریباً دو مہینے گزر چکے تھے۔ اشرف کے اندر فلم بینی کے حوالے سے ایک خلا سا پیدا ہو چکا تھا۔ اسے فلم کی پیاس بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک دن اپنے مشترکہ دوست ٹیڈی کے گھر ان دونوں نے وڈیو پر ارمان کی ایک تازہ فلم دیکھی۔ اس فلم کی بڑی شہرت تھی کیونکہ اس فلم کی ہیروئن کے علاوہ پروڈیوسر بھی وہ خود تھی۔ اس فلم میں ارمان نے واقعی بڑا دبنگ کام کیا تھا۔ فلم میں بے شمار گانے تھے اور ہر گانے میں اس نے پندرہ پندرہ لباس تبدیل کئے تھے۔ تاہم غور کیا جاتا تو ان پندرہ لباسوں پر بمشکل دو تین لباسوں کا کپڑا ہی لگا تھا۔

فلم بینی اور ٹیلی ویژن بینی کی دبی ہوئی چنگاری دیکھتے ہی دیکھتے پھر بھڑک اٹھی۔ وہ چپکے چپکے جہانگیر اور ٹیڈی کے ساتھ سینما بھی جانے لگا۔ ہوش ربا اداؤں والی ارمان اشرف کو ایک روگ کی طرح لگ چکی تھی۔ ایک بار پھر یہ روگ اشرف کے اندر شدت پکڑنے لگا۔ اس کا فطری تجسّس اسے عورت کے حوالے سے بے قرار کرنے لگا۔ اب وہ نویں میں تھا، قد بھی تھوڑا سا اور نکل آیا تھا لیکن دیکھنے میں وہ اب بھی نو عمر لڑکا تھا۔

ڈھائی تین مہینے گزرنے کے باوجود اب بھی چوتھے پانچویں روز اشرف اپنا انگوٹھا دکھانے خلیفہ رمضان کے پاس جاتا تھا۔ شاہی قلعے کے قریبی علاقے میں آمدورفت کے دوران میں اشرف نے کچھ عجیب سے مناظر دیکھے تھے۔ چونکہ اکثر وہ اکیلا ہی ہوتا تھا اس لئے اس کا تجسّس اسے کشاں کشاں ارد گرد کی گلیوں میں پھراتا رہتا تھا۔ یہاں اس نے رنگ برنگ کپڑے پہنے ہوئے عورتوں کو دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر سرخی پوڈر کی لیپا پوتی ہوتی تھی۔ وہ دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی راہ گیروں کو عجیب و غریب اشارے کرتی تھیں۔ کچھ گھروں کے اندر سے گانے بجانے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ جلد ہی اشرف کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی بازار حسن ہے جس کے مناظر اس نے پاکستان اور انڈیا کی فلموں

میں دیکھے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ بازار حسن ہے تو پھر اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔

اس نے جہانگیر اور طوطے کو اس بارے میں بتایا تو جہانگیر فوراً بولا۔ "اوئے باندر! ادھر تو سنا ہے پولیس پھرتی ہے۔ بڑی عمر کے بندوں کی اور بات ہے، لڑکوں کو تو پکڑ کر فوراً بند کر دیتے ہیں۔"

"تم بالکل ڈرپوک ہو۔" طوطے نے فوراً کہا۔ "میں نے وہاں اپنے سے بھی آدھی عمر کے لڑکے دیکھے ہیں۔ ویسے بھی ہر مزیدار کام میں تھوڑا بہت خطرہ تو ہوتا ہے۔"

اس دن بازار حسن کے بارے میں ان تینوں کے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور اشرف کے اندر چپکے چپکے ایک بے پناہ تجسّس پروان چڑھتا رہا۔ چند ماہ پہلے "تحفہ" فلم دیکھ کر اس کے اندر جو آگ بھڑکی تھی، وہ پھیلتے پھیلتے اب جنگل کی آگ بن گئی تھی۔

وہ سرما کا ایک ابر آلود دن تھا۔ کسی وقت ہلکی بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں۔ اشرف کی جیب میں سو روپے کا ایک کڑکتا ہوا نوٹ تھا۔ اس کے علاوہ دس دس کے پانچ نوٹ تھے۔ اس نے خلیفہ رمضان سے انگوٹھے کی آخری پٹی کروائی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے نہایت "طاقت ور تجسّس" نے بڑی مضبوطی سے اس کی انگلی پکڑی اور اسے بازار حسن کی ایک اندرونی گلی میں لے گیا۔ گاؤں رنگی کے سب سے نیک نام شخص قدرت اللہ صاحب کا چودہ سالہ لڑکا دنیا کا بدنام ترین سودا خریدنے کے لئے بدنام ترین بازار میں کھڑا تھا۔ اس کی جیب میں وہ ایک سو تیس روپے تھے جو اس نے جیب خرچ سے بچا بچا کر رکھے تھے۔ اس کے سینے میں اس کا دل بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بازار کے سرے پر کھڑا تھا۔ بازار کے اندر جھروکے سجے تھے اور بھاؤ تاؤ ہو رہے تھے۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ بازار کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا مگر اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ صدیوں کا فاصلہ بن گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ برسوں اسی طرح کھڑا رہے گا لیکن قدم آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ یہ کیسی قربت تھی اور کیسی دوری تھی۔ اس کا تجسّس اسے بے پناہ قوت سے کھینچ رہا تھا، اس کے نو عمر ذہن میں خیمہ زن جھجک نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ کافی دیر لگی مگر بہرحال فیصلہ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے خاص الخاص بازار میں داخل ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ جب بندہ بوکھلایا ہوا ہو تو اس سے اکثر الٹا کام ہی ہوتا ہے۔ اشرف

سے بھی الٹا کام ہوا۔ وہ ایک دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے کان شائیں شائیں کر رہے تھے اور ارد گرد کی ہر شے نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ایک عورت اس کے سامنے آئی۔ وہ درمیانی عمر کی فربہ اندام عورت تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے چمک رہے تھے۔

"آؤ سرکار آؤ۔" اس نے اشرف کو اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے کہا۔

اشرف گنگ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "فرماؤ جی۔ جناب کی کیا خدمت کریں؟"

اشرف خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اشرف کی صورت دیکھ کر عورت ہنسی اور اس کے پان سے رنگے ہوئے دانت نمایاں ہو گئے۔ وہ اشرف کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ یہاں ایک بڑا سرخ قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکئے لگے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ موسیقی کے بہت سے ساز پڑے تھے عورت نے اشرف کو ایک جانب صوفے پر بٹھایا۔ اب ایک اور عورت نما لڑکی بھی وہاں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے تھے اور پاؤں میں گھنگھرو بندھے تھے۔ وہ پنجابی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہاں باؤ جی! کیا سنائیں آپ کو۔ فلمی گانا' گیت' غزل یا کچھ اور؟"

اشرف کو یوں لگا جیسے وہ کسی غلط دکان پر آگیا ہے' لیکن یہ سوچ اس کی زبان پر نہ آسکی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ ٹک ٹک دیدم............ دم نہ کشیدم۔

عورت نما لڑکی نے پھر کہا۔ "ہائے ہائے باؤ! تم کچھ بولو گے بھی کہ نہیں؟"

"وہ............ وہ دراصل............ میں............ لیکن۔" وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

درمیانی عمر کی عورت کے چہرے پر اب تھوڑی سی سختی آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہ بکری کی طرح میں میں کیا کر رہے ہو۔ جو دل میں ہے بتاؤ۔"

اشرف کا حلق سوکھ گیا تھا۔ اسے حلق تر کرنے کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔ میز پر اس کے سامنے کوک کی ٹھنڈی بوتل رکھ دی گئی تھی' مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر بوتل اٹھا سکتا۔

گھنگھروؤں والی لڑکی بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں' یہ بلونگڑا کیوں چکرایا ہوا ہے۔ گانا شانا سننے کے لئے نہیں آیا۔"

موٹی عورت اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "تماش بینی کرنے سے پہلے اپنے کسی بڑے

سے طور طریقے پوچھ لیتے ہیں۔ چلو اٹھو یہاں سے چلو۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

اشرف ایک دم یوں کھڑا ہو گیا جیسے صوفے نے ڈنک مار دیا ہو۔ گھنگھروؤں والی نے کہا۔ "کاکا جی! تم جس کام کے لئے آئے ہو وہ یہاں نہیں ہوتا۔ یہاں صرف گانا بجانا ہوتا ہے۔"

موٹی عورت نے تحکم سے کہا۔ "چل جلدی سے بوتل کے پیسے نکال۔"

"وہ............ وہ............ دراصل............ میں۔" وہ پھر ہکلا کر رہ گیا۔

"اوئے پیسے نکال پھر بکری کی طرح میں میں کرنے لگا ہے۔"

اس نے زبردستی اشرف کی جیب میں ہاتھ گھسایا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر اسے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

بے عزتی کے شدید احساس کے زیر اثر اشرف نے گھوم کر موٹی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "اوئے ڈیلے نکال کر کیا دیکھ رہا ہے۔ ایک جھانپڑ دوں گی۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

اس نے اشرف کو ایک اور دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا گلی میں آگیا۔ باہر کئی مسکراتی نظروں نے اسے دیکھا۔ اشرف کو لگا جیسے اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ وہ تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کہ ساری دنیا کے لوگوں کی انگلیاں اس کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ وہ بیک زبان کہہ رہے ہیں۔ "وہ دیکھو۔ وہ ہے قدرت اللہ صاحب کا بیٹا۔ یہ نویں جماعت میں پڑھتا ہے اور یہ ہیرا منڈی میں کنجریوں کے دھکے کھا رہا ہے۔" وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اسے اپنے عقب میں چند قہقہے سنائی دیئے۔ پتا نہیں یہ قہقہے اس پر لگائے گئے تھے یا نہیں لیکن وہ اس کے کانوں تک ضرور پہنچے۔

خبر نہیں کہ کیا ہوا' ایک مرتبہ سخت بے عزت ہونے کے بعد اس کی جھجک ختم ہو گئی۔ اس کے پاؤں جو کچھ دیر پہلے منوں وزنی ہو چکے تھے' بڑی حد تک ہلکے ہو گئے۔ گلی کے ایک خم نے اسے اس مقام سے اوجھل کر دیا تھا جہاں وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب اس کے قدم کافی اعتماد سے اٹھ رہے تھے۔ اس کے دونوں جانب حسن کے سیل پوائنٹ تھے۔ فروخت کا مال ڈسپلے کے لئے جھروکوں اور دروازوں میں سجا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے سجی بنی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر ایک نسبتاً جواں سال لڑکی کی طرف بڑھا اور اس کے

ساتھ کمرے میں گھس گیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔ در و دیوار میں ایک عجیب طرح کی باس رچی ہوئی تھی۔ یہاں گانے بجانے کا سامان اشرف کو دکھائی نہیں دیا۔ اس کو تسلی ہو گئی۔

☆==========☆==========☆

تارا کو اشرف شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ رنگی گاؤں میں وہ دونوں اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ اگر اشرف کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جاتا تھا تو عجیب سی بے قراری تارا کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی تھی۔ وہ چھوٹی تھی لہٰذا اس بے قراری کی وجہ نہیں جانتی تھی، نہ ہی وہ اس بے قراری کو کوئی نام دے سکتی تھی.......... مگر اب کچھ عرصے سے اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس میں اور اشرف میں کوئی ایسا تعلق ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔

چند ماہ پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا، مگر پھر اوپر تلے دو ایسے واقعات ہوئے تھے جس نے بہت کچھ درہم برہم کر دیا تھا۔ ان دنوں اشرف کے رویے میں تارا کو عجیب طرح کی تبدیلی نظر آئی تھی۔ وہ ان کے گھر کثرت سے آتا تھا اور تارا کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا تھا پھر ایک دو بار تنہائی میں اس نے عجیب سی باتیں کی تھیں۔ فلم کی کہانی سناتے سناتے اس نے فلموں ڈراموں والی حرکتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ ایسے لمحوں میں وہ تارا کو بالکل اجنبی اور بیگانہ سا لگا تھا۔ اس کے رویے نے تارا میں بیزاری پیدا کی تھی پھر اس دن امی نے بھی سب کچھ دیکھ لیا تھا اور تارا کے سامنے ہی اشرف کو زور دار تھپڑ بھی مارا تھا۔ تارا کئی دن تک خوف زدہ اور سہمی ہوئی رہی تھی۔

اس واقعے کے بعد اشرف کے ساتھ اس کی بات چیت بہت کم ہوئی تھی۔ وہ پھپھو کے گھر بھی کم ہی جاتی تھی۔ امی نے اسے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اکیلی پھپھو کے گھر نہیں جائے گی پھر کچھ ہی دن بعد وہ باجی نشاط والا واقعہ ہو گیا تھا۔ اس واقعے نے تارا کو اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ کئی دن تک کمرے میں گھس کر چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا۔ "اشرف ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ وہ تو اتنا اچھا تھا، پھر کیوں ایک دم اتنی ساری برائی اس کے اندر اکٹھی ہو گئی ہے۔ اس نے باجی نشاط کے ساتھ پتہ نہیں کیسی بدتمیزی کی تھی جس کی وجہ سے باجی نشاط اور پھوپا جان سے اتنی مار پڑی۔"

وہ نماز پڑھ کر اکثر دعا مانگتی تھی۔ "اے اللہ میاں! اشرف کو پھر سے اچھا کر دے۔ اسی طرح ہنستا مسکراتا اور پیاری پیاری باتیں کرتا ہوا اشرف۔ اس کے دماغ میں سے ہر قسم کی برائی ختم ہو جائے۔ وہ وہی کچھ کرے جو پھوپا اور دوسرے "بڑے" اس سے کہتے ہیں۔"

جب وہ لوگ گاؤں میں تھے اس نے کئی بار اپنے بڑوں کی زبان سے اڑتی اڑتی سی بات سنی تھی کہ تارا کی شادی اشرف سے ہو گی۔ ایسی بات سن کر وہ بے وجہ شرما جایا کرتی تھی۔ گاؤں میں گھر کے اندر چھوٹے چھوٹے کھیل کھیلتے ہوئے جب کبھی اشرف اور تارا کے درمیان جھگڑا ہو جاتا تھا تو اشرف کہا کرتا تھا۔ "اگر تم نے میری بیوی بن کر اس طرح جھگڑا کیا تو پھر میں تمہیں خوب مارا کروں گا اور تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔"

وہ اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہتی تھی۔ "میرا دماغ خراب ہے کہ میں تم سے شادی کروں گی۔ میری شادی تو کسی بہت بڑے ڈاکٹر سے ہو گی۔"

دونوں کا جھگڑا مزید بڑھ جاتا تھا مگر پھر جلد ہی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں زیادہ دیر ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔

تارا کے ذہن میں اشرف اب بھی اسی طرح براجمان تھا جس طرح گاؤں میں تھا۔ ابھی صرف چار پانچ دن پہلے، جب قاری صاحب انہیں ایک حدیث کی تشریح سمجھا رہے تھے اور انہوں نے تارا کو تشریح کی ایک سطر پڑھنے کے لئے کہا تو وہ بری طرح اٹک گئی۔ سطر اس طرح تھی۔ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔" اس سطر میں اشرف کا لفظ تھا لہٰذا تارا کی زبان ایک دم لڑکھڑا گئی۔ قاری صاحب نے ڈانٹا تو اس نے بڑی مشکل سے سطر مکمل کی۔

آج بھی موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی بوندا باندی کے سبب ٹھنڈ میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ اسکول سے چھٹی تھی۔ اصغر باہر کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ تارا امی کا ہاتھ بٹانے کے بعد دس بجے سے لحاف میں گھسی بیٹھی تھی اور اشرف کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اچانک امی کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ "تارا لحاف چھوڑ دے دوپہر ہو گئی ہے۔"

"امی بات دوپہر کی نہیں ہوتی ٹھنڈ کی ہوتی ہے اور ٹھنڈ تو صبح کی طرح ہی ہے۔ آپ بھی لحاف میں آجائیں۔"

امی ذرا تذبذب میں رہیں پھر وہ بھی لحاف میں تارا کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے نہایت گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ امی کا اچھا موڈ دیکھ کر تارا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "امی! اب ہم پھپو کے گھر زیادہ کیوں نہیں جاتے۔ وہ بھی ذرا کم ہی آتی ہیں۔"

"آتی تو ہیں' ابھی پچھلے ہفتے آئی تھیں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بب........ بس ویسے ہی امی۔"

اس کی امی نے دھیان سے اسے دیکھا اور ذرا خشک لہجے میں بولیں۔ "دیکھو طاہرہ! تم صرف اپنی پڑھائی کی طرف دھیان رکھو۔ الٹی سیدھی باتیں مت سوچا کرو اور اس دن مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ تم نے پھپو سے کیوں پوچھا تھا کہ اشرف کہاں ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

تارا سہم کر خاموش ہو گئی۔ اس کی امی سمجھانے والے انداز میں اس سے باتیں کرنے لگیں۔

☆==========☆==========☆

اشرف ساڑھے چودہ سال کی عمر میں ہی مرد بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے وہ پھل چکھ لیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو چکھے وہ پچھتاتا ہے اور جو نہ چکھے وہ بھی پچھتاتا ہے۔ اس روز پولیس والوں سے ڈر کر وہ جس دروازے میں داخل ہوا تھا' وہاں اس کی ملاقات ممتاز عرف رانو نامی لڑکی سے ہوئی تھی۔ رانو کا رنگ گندمی تھا۔ جسم پتلا تھا اور کئی جگہ ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں' بہرحال اس کے نقش برے نہیں تھے۔ اس روز رانو نے اس کی جیب ہلکی کر دی تھی اور اسے بھی ہلکا کر دیا تھا۔ تجسس اور بے قراری کی وہ بھاری گٹھڑیاں اس کے سر سے اتار دی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ پسا جا رہا تھا۔

اس روز کے بعد اشرف وقفے وقفے سے یہاں آنا شروع ہو گیا۔ شروع میں اسے پولیس والوں سے خوف آتا تھا اور راہ گیر بھی بردہ فروش لگتے تھے' مگر بتدریج اس کا خوف کم ہو گیا۔ جونہی اس کے پاس معقول پیسے اکٹھے ہوتے وہ خلیفہ رمضان کو انگوٹھا دکھانے کے بہانے شاہی قلعے کا رخ کرتا اور شاہی قلعے جانے کی بجائے رانو کے پاس جا پہنچتا۔ رانو نے پتا نہیں اسے کیا پلا دیا تھا' وہ ہر وقت رانو کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا۔ ارمان' تارا' نشاط' وقتی طور پر سب کچھ پس منظر میں چلا گیا تھا........ لیکن نہیں۔ شاید ارمان پس منظر میں نہیں گئی تھی۔ وہ تو جان چھوڑنے والا روگ ہی نہیں تھی۔ جب وہ

رانو کے پاس ہوتا تو کمرے کی نیم تیرگی میں اسے رانو کی گندمی صورت میں بھی ارمان کا جگمگ کرتا ہوا چہرہ ہی دکھائی دیتا۔ رانو اسے چھوٹے بالم کہہ کر پکارتی تھی۔ جب وہ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوتا تو وہ سب سے پہلے اس کی جیب ٹٹولتی پھر اسے لے کر چارپائی پر بیٹھ جاتی۔ وہ کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہتی' لگتا تھا کہ وہ بھی اس میں تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگی ہے۔ پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد کمرے کی تیز لائٹ بجھ جاتی۔

رانو کی قربت اشرف کے جذبات کے بہاؤ کو معمول پر لے آتی تھی۔ کسی وقت تو اسے یہ لگتا تھا کہ دنیا میں رانو سے بہتر عورت کوئی ہے ہی نہیں۔

ایک دن رانو نے اس سے پوچھا۔ "چھوٹے بالم! تیرا کوئی یار دوست نہیں؟"

"بس تھوڑے سے ہیں۔"

"کون کون؟"

"ایک ٹیڈی ہے' ایک جہانگیر اور ایک طوطا۔"

"تو ان میں سے کوئی تیری طرح دلیر مرد نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"ان میں سے کسی کو ساتھ کیوں نہیں لاتا؟"

"دراصل۔ دراصل۔"

"اچھا میں سمجھ گئی۔ تُو بڑا خچرا ہے۔ تُو نے ان میں سے کسی کو بتایا ہی نہیں۔"

اشرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ "پھر تُو ہی ذرا جلدی جلدی آیا کرنا۔ میں دو دو ہفتے تیرا انتظار کرتی رہتی ہوں۔"

"تت........ تیرے پاس پیسے دینے والے اور بھی تو آتے ہیں۔"

"مجھے ان کے پیسے اچھے نہیں لگتے۔ تیرے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔" وہ بات بدل کر بولی۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"چھوٹے بالم تم بڑے صاف ستھرے اور پیارے سے ہو۔ جو دوسرے آتے ہیں' وہ تو بیماریوں کے گھر ہوتے ہیں۔ بری بری صورتیں' بری بری آوازیں' ان کے منہ سے ایسی بدبوئیں آتی ہیں کہ بس اللہ معافی۔"

اشرف کافی تجربے کار ہو چکا تھا' پھر بھی اس کے اندر وہ بھولپن پوری طرح مرا نہیں تھا جس کا تعلق اس کی عمر سے تھا۔ وہ رانو کے دیئے ہوئے سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔ "اگر میں کسی وقت کہیں سے تجھے بہت سے روپے لادوں تو کیا تم اس بازار میں بیٹھنا چھوڑ دو گی؟"

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے عام سے انداز میں کتنا بڑا سوال پوچھ لیا ہے۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب صدیوں سے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ "جب تم لاؤ گے پھر دیکھوں گی۔"

بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اشرف نے رانو کے پاس جانا جاری رکھا۔ وہ اکثر اسکول سے بھی غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ رانو چاہتی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک بار تو اس کے پاس ضرور آئے۔ اشرف پانچ چھ دن پیسے جمع کرتا رہتا تھا مگر عموماً وہ کم پڑ جاتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ وہ کبھی کبھی امی کی الماری سے بھی پیسے نکالنے لگا۔ سودا لینے بازار جاتا تو اس میں سے پیسے بچانے کی کوشش کرتا۔ رانو کی قربت اس کی ضرورت بنتی جا رہی تھی' بالکل جیسے آہستہ آہستہ سگریٹ اس کی ضرورت بن گیا تھا' اور فلمیں اس کی ضرورت بن گئی تھیں اور ٹیڈی طوطا وغیرہ اس کی ضرورت بن گئے تھے۔ بہرحال یہ اشرف کی سمجھ داری تھی کہ اس نے ابھی تک اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی بازارِ حسن والی بات چھپا رکھی تھی۔ اس کا انگوٹھا کب کا ٹھیک ہو چکا تھا مگر وہ اب بھی کبھی کبھی درد کی شکایت کرتا رہتا تھا۔ ایسے میں امی چپکے سے اسے بیس تیس روپے دے دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ جاؤ خلیفہ رمضان سے پٹی کروا آؤ۔

فلمیں دیکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ فلمیں دیکھنے کے لئے ایک بڑا اچھا اڈا اشرف اور جہانگیر کے ہاتھ آگیا تھا۔ طوطے نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا اور مکمل طور پر موٹر مکینکی شروع کر دی تھی' وہ جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا اس کا مالک استاد جیدا نامی ایک شخص تھا بلکہ اسے نوجوان ہی کہنا چاہئے۔ وہ خود بھی فلموں کا بڑا رسیا تھا۔ اس نے ورکشاپ کی چھوٹی سی چھت پر جہازی سائز کی تین ڈشیں لگا رکھی تھیں۔ پچھلے کمرے میں ہر وقت ٹی وی چلتا رہتا تھا اور دھڑا دھڑ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں آتی رہتی تھیں۔ اکثر جب اشرف اسکول کے لئے گھر سے نکلتا تھا تو جہانگیر کے ساتھ اسی ورکشاپ میں پہنچتا تھا۔ ٹی وی دیکھنے کا معاوضہ تھوڑا ہی ہوتا تھا۔ کبھی استاد جیدے کے لئے ولز کے چار پانچ

سگریٹ.......... کبھی چائے کا ایک کپ اور کبھی استاد کی مٹھی چاپی۔ استاد کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں۔ جہانگیر نے اسے بڑی رازداری سے بتایا تھا کہ استاد بوتل لگاتا ہے۔

"یہ بوتل کیا ہوتی ہے؟" اشرف نے پوچھا تھا۔

"یار! تُو اتنا گھوم پھر کر اب بھی تھوڑا تھوڑا پینڈو ہے۔ بوتل کا مطلب ہوتا ہے شراب۔ ابھی پرسوں والی فلم میں دیکھا نہیں تُو نے۔ امیتابھ بچن' ریکھا کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے کس طرح گلاس پر گلاس چڑھا رہا تھا۔"

اشرف سرہلا کر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر تجسّس کی ایک اور چھوٹی سی لَو بھڑک اٹھی تھی۔

ایک دن جب وہ اسکول سے یعنی استاد جیدے کی ورکشاپ سے چھٹی کر کے گھر پہنچا تو امی کچھ پریشان نظر آئیں۔ اسی دوران میں ممانی بھی اندرونی کمرے سے نکل آئیں۔ ممانی کی زبانی اشرف کو پتا چلا کہ تارا کو سیڑھیاں اترتے ہوئے موچ آگئی ہے' اسے پہلوان کے پاس لے جانا ہے۔ اسی دوران میں دروازے پر ٹیکسی بھی آکر رک گئی۔

اشرف کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لوگ خلیفہ رمضان کے پاس جا رہے تھے۔ اشرف اب بھی خلیفہ سے پٹی کرانے کے بہانے امی سے پیسے اینٹھتا تھا حالانکہ خلیفہ کی شکل دیکھے ہوئے اسے تین مہینے ہو چکے تھے۔

امی نے کہا۔ "اشرف! تم بھی چلو ساتھ۔"

اشرف نے ٹال مٹول کی کوشش کی مگر اس کی امی کے ذہن میں شاید یہ تھا کہ وہ بھی اپنا ہاتھ دکھا لے گا۔ امی نے اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

تارا کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آج کافی دنوں بعد اشرف نے تارا کو ذرا غور سے دیکھا۔ اس کی رنگت نکھر آئی تھی' بال کچھ مزید گھنے ہو گئے تھے اور وہ بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ تارا کے گھنے لمبے بال اشرف کو ہمیشہ سے بہت پسند تھے' چند لمحوں کے لئے اس کی نگاہ ان بالوں سے الجھ کر رہ گئی مگر پھر فوراً ہی اسے امی کا خیال آگیا اور خلیفہ رمضان کا خیال آگیا اور وہ تارا کو بھول کر پھر سے اپنی پریشانی میں ڈوب گیا۔

وہ لوگ تارا کو لے کر خلیفہ کی دکان پر پہنچے تو اشرف کے ذہن میں ان گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ خلیفہ نے ماہرانہ انداز میں تارا کے گورے چٹے پاؤں کی موچ نکالی اور

اس پر روئی وغیرہ رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اشرف کو اندیشہ تھا۔ اشرف کی امی نے خلیفہ جی سے کہا۔ "ابھی اشرف کو اور کتنی پٹیاں لگیں گی؟"

"اور پٹیاں کیا مطلب؟" خلیفہ نے حیران ہو کر کہا۔ "پٹیاں تو دو مہینے پہلے ہی ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے تیل دیا تھا کہ بس کبھی کبھی لگاتے رہنا۔"

اشرف کی امی نے حیرانی سے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ امی نے بے ساختہ کہا۔ "لیکن اشرفی! تم تو ابھی تین دن پہلے مجھ سے پٹی کے پیسے لے کر آئے ہو؟"

"وہ.......... دراصل.......... وہ..........." اشرف ہکلا کر رہ گیا۔

خلیفہ رمضان گہری نظروں سے اشرف کو دیکھ رہا تھا۔ توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "لگتا ہے کاکے نے کوئی ڈراما کیا ہے بہن جی کے ساتھ۔" پھر اس نے اشرف کی والدہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور دکان کے دوسرے حصے میں لے گیا۔ دونوں تین چار منٹ تک وہاں کھسر پھسر کرتے رہے۔ ممانی کی ساری توجہ تارا کی طرف تھی۔ انہوں نے غالباً خلیفہ اور اشرف کی امی کے درمیان ہونے والا شروع کا مکالمہ سنا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد خلیفہ جی واپس آکر اپنی گدی پر بیٹھ گئے۔ امی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ کرخت نظروں سے اشرف کو دیکھ رہی تھیں۔

جیسا کہ اشرف کو بعد میں معلوم ہوا' خلیفہ نے اشرف کی والدہ کو بتایا تھا کہ ایک دو بار اشرف یہاں کی بدنام گلی میں گھومتا دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اس پر نظر رکھیں۔ گھر آکر والدہ اشرف پر پھٹ ہی پڑی تھیں۔ انہوں نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری زندگی حرام کر دی ہے اشرفی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تُو کم بخت ادھر گاؤں میں ہی رہتا۔ نہ تجھے شہر کی ہوا لگتی نہ تُو ان گندگیوں میں گرتا۔ اگر تیرے باپ کو تیری ان آوارہ گردیوں کا پتا لگ گیا تو سچ کہتی ہوں وہ کھڑے کھڑے تیری کھال ادھیڑ دیں گے۔ وہ بڑے عاجز آئے ہوئے ہیں تجھ سے۔"

اشرف بس سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔

اس کی والدہ نے اسے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "بتا ان پیسوں کا کیا کرتا رہا ہے جو مجھ سے لے جاتا رہا ہے؟"

"وہ جمع کر کے بسنت پر گڈی ڈور لایا تھا۔" اشرف نے سفید جھوٹ بولا۔ گڈی

ڈور کے لئے اسے چپکے سے ماموں نے پیسے دیئے تھے۔

وہ ابا جان' کے سامنے تو پتنگ اڑانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ شوق منٹو پارک جا کر پورا کیا تھا۔

اشرف کی والدہ نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور شہادت کی انگلی کھڑی کرتی ہوئی بولیں۔ "دیکھ اشرفی! میں تجھے بس ایک موقع دے رہی ہوں۔ اب اگر مجھے شک بھی پڑا کہ تُو اس گندے علاقے کی طرف گیا ہے تو تیرے ابا سے فوراً شکایت کر دوں گی پھر اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار میں نہیں ہوں گی۔"

اشرف بس اثبات میں سرہلا کر رہ گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے اب اس "وارننگ" سے چڑ سی ہوتی جا رہی تھی۔ آپا عارفہ بھی جب بولتی تھیں' یہی کہتی تھیں' میں ابا جان سے تمہاری شکایت لگا دوں گی۔ بھائی جان اور امی جان کی زبان پر بھی بس یہی فقرہ رہتا تھا۔ اشرف کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہے۔ یہاں سے گرا تو سیدھا ابا جان کے سامنے گرے گا اور وہ اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دیں گے۔ اشرف کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ ابا جان کے پاس بیٹھے' ہلکے پھلکے انداز میں سب گھر والے ابا جان سے بات چیت کریں۔ ابا جان ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی تفریحات میں شریک ہوں مگر پتا نہیں کیا بات تھی' ابا جان کے پاس ان کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی وقت وہ کوئی بات کرتے بھی تھے تو وہ نصیحت ہوتی تھی' حکم ہوتا تھا یا وارننگ ہوتی تھی آخر ماموں جان بھی تو بزرگ تھے' وہ تارا اور دوسرے بچوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے' ہنستے کھیلتے تھے مگر ابا جان کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ ان کا ذہن مذہبی تھا لیکن روز بہ روز انتہا پسندی کی طرف مائل تھا۔ وہ کسی معاملے میں ذرا سی لچک رکھنے کو بھی تیار نہیں تھے۔

امی کے سمجھانے بجھانے پر اشرف نے پورا ایک مہینہ اس بازار کا رخ نہیں کیا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ بازارِ حسن میں اپنی آمدورفت کے معاملے کو زیادہ دیر راز نہیں رکھ سکے گا۔ ایک مہینہ تو اس نے کسی طرح کاٹ لیا' مگر پھر اس کی بے قراری حد سے بڑھ گئی۔ دو نادیدہ بانہیں جیسے اپنی پوری قوت سے اسے پرانے راستے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن پر حملہ آور تھیں۔ ایک نیم تاریک کمرے کی سیلن زدہ بو' الجھے سلجھے بالوں کا لمس' کان میں گدگدی کرتی ہوئی گرم سانس کی

سرگوشی اور کسی قریبی چار دیواری میں گھنگھروؤں کی چھن چھن۔

ایک دن وہ جیسے کسی تیز آبی ریلے میں بہتا ہوا شاہی قلعے جا پہنچا اور پھر اس بازار میں۔

رانو اسے دیکھ کر ناراض ہوئی اور حیران بھی۔ اس نے سر کے بالوں سے پکڑ کر اشرف کو جھنجوڑا اور بولی۔ "تم بڑے ظالم ہو چھوٹے بالم۔ تمہیں پتا نہیں، مجھ پر کیا بیتی ہے۔ کتنا انتظار کرتی رہی ہوں تمہارا۔"

"میں بیمار ہو گیا تھا۔" اشرف نے وہی بہانہ بنایا جو اسکول نہ جانے پر بناتا تھا۔

رانو، اشرف کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔ "چھوٹے بالم۔ اب شاید ہم کبھی نہ مل سکیں۔"

اشرف کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"ہوا تو کچھ نہیں، بس سمجھ لے کہ اب ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں۔ اب تم.........یہاں نہ آیا کرو۔"

"لیکن کیوں۔ ایسی بات کیوں کر رہی ہو تم؟"

"ساری باتیں بتانے والی تو نہیں ہوتیں۔"

"تو کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟"

"میرے چھوٹے بالم! میں تجھے کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ بس میری یہ بنتی ہے کہ اب یہاں نہ آیا کرو۔"

"مجھے وجہ تو بتاؤ، آخر ہوا کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اچھا آج نہیں۔ پرسوں آنا پھر بتاؤں گی۔"

اشرف بوجھل دل لے کر گیا تھا، بوجھل تر دل لے کر واپس آ گیا۔

دو دن اس نے بے حد پریشانی کے عالم میں گزارے۔ تیسرے دن وہ پھر وہاں پہنچا۔ آج معاملہ پہلے سے بھی حوصلہ شکن تھا۔ رانو نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اشرف نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار۔ دو بار......... پھر اس نے لرزتی آواز میں رانو کو پکارا۔ دوسری تیسری آواز پر رانو نے اندر سے کہا۔ "اشرف! تم چلے جاؤ۔ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

اشرف کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔ "مگر تم نے تو کہا تھا کہ پرسوں تمہیں بتاؤں گی۔ ایسا مت کرو۔ دروازہ کھولو، میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

رانو خاموش رہی لیکن جب اشرف کا اصرار بڑھ گیا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ آج وہ لان کی بڑی خوب صورت گلابی شلوار قمیض میں تھی۔ قمیض کے گریبان میں سے اس کی ہنسلی کی ہڈیاں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ آج شاید اس نے شیمپو بھی کر رکھا تھا کیونکہ اس کے روکھے پھیکے بالوں میں چمک تھی۔ وہ اپنی پتلی کلائیوں میں چوڑیوں کو گھماتی رہی اور اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہراتی رہیں۔

پرسوں کی طرح آج بھی رانو نے دل کی بات بتانے میں پس و پیش کیا مگر جب اشرف نے زیادہ اصرار کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر یوں گویا ہوئی۔ "آج سے چند سال پہلے میرا بھائی ہیروئن پینے لگا تھا اور سخت بیمار ہو گیا تھا۔ اس کے علاج معالجے کے لئے میں نے مرجان نامی ایک شخص سے قرضہ لیا۔ یہ قرضہ بڑھتے بڑھتے بیس ہزار روپے ہو گیا۔ اب کئی مہینوں سے مرجان خاں نامی یہ شخص مجھے تنگ کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس کی رقم واپس کروں۔ وہ نشہ کر کے وقت بے وقت یہاں گھس آتا تھا۔ کئی کئی گھنٹے یہاں رہتا تھا اور گالیاں وغیرہ بھی دیتا تھا۔ دو تین ہفتے پہلے وہ ایک واقف تھانے دار کو یہاں لے آیا۔ پولیس والے مجھے تھانے لے گئے اور بری طرح ڈرایا دھمکایا۔ وہاں طے ہوا کہ میں اگلے مہینے کی پچیس تاریخ تک پندرہ ہزار روپیہ مرجان کو دوں گی یا پھر اس کے ساتھ جہاں وہ چاہے گا چلی جاؤں گی۔ اب میعاد ختم ہونے میں آٹھ دس دن رہ گئے ہیں اور میں کچھ بھی نہیں کر سکی۔ مشکل سے دو ہزار اکٹھا کیا تھا۔ اس میں سے پرسوں ایک ہزار پولیس والا لے گیا کیونکہ میں پچھلے مہینے بھی اسے "ماہوار" نہیں دے سکی تھی۔ اب صرف ایک ہزار روپیہ میرے پاس ہے۔ مرجان خاں یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی لے جانا چاہتا ہے۔ اب پچیس چھبیس تاریخ تک میں یہاں سے جا رہی ہوں۔"

دل اشرف کے سینے میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ رانو کا شانہ تھام کر بولا۔ "نہیں۔ میں تم کو نہیں جانے دوں گا۔"

"چھوٹے بالم! کیا کرو گے تم؟ مرجان خاں بڑا سخت بندہ ہے۔"

اشرف کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میں تمہیں پیسے لاکر دوں گا۔ تم یہ پیسے اس خبیث کے منہ پر مارنا۔"

"تم کہاں سے لاؤ گے پیسے؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ بس میں تمہیں بتادوں۔ تمہیں یہاں سے جانا نہیں ہے۔"

اگلے روز اشرف نے امی جان کی لوہے کی الماری میں سے سونے کے دو بُندے اور دو انگوٹھیاں نکال لیں۔ یہ چیزیں امی نے دو تین مہینے پہلے آپا عارفہ کے لئے بنوا کر رکھی تھیں۔

اشرف کے دوستوں میں طوطا سب سے بڑا تھا۔ اتفاقاً سُوہے بازار میں طوطے کا ایک دوست زیورات کی دھلائی اور پالش کا کام کرتا تھا۔ اشرف نے طوطے کو اپنا رازدار بنایا اور اس کی مدد سے بُندے اور انگوٹھیاں بیچ کر تیرہ ہزار روپے حاصل کر لئے۔ ایک ہزار روپیہ طوطے نے اسے اپنے استاد جیدے سے ادھار لے دیا' یوں اس کے پاس چودہ ہزار روپیہ ہو گیا۔ اشرف نے طوطے کو رانو وغیرہ کے بارے میں اس شرط کے ساتھ بتا دیا تھا کہ وہ کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ طوطے نے فلمی انداز میں اشرف کا کندھا تھامتے ہوئے کہا تھا۔ "اوئے! ہم بجنوں کے سجن ہیں۔ میں جان دے سکتا ہوں لیکن اپنے یار کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا۔"

اسی دن اشرف رقم جیب میں ڈال کر رانو کے پاس پہنچا۔ اس نے روپے رانو کے سامنے رکھے تو اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر اشرف کو چوم لیا۔ آج رانو نے دل کھول کر پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ کمرے کی سیلن زدہ باس قدرے دبی ہوئی تھی۔ رانو کے کپڑے بھی اچھے تھے۔ رانو نے تھوڑا سا پھل کاٹ کر اشرف کے سامنے رکھا اور ٹھنڈے دودھ کا گلاس بھی لے آئی۔

"اتنے روپے کہاں سے لے آئے چھوٹے بالم؟"

"بس لے آیا اس بات کو چھوڑو۔"

"کتنے ہیں؟"

"چودہ ہزار۔ تم ہزار اپنے پاس سے ڈال کر پورے پندرہ کر لو اور اس کمینے کے منہ پر مارو۔"

"ہائے چھوٹے بالم! تم نے تو میرا کلیجہ ہی نکال لیا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اپنی

کھال اتار کر تیرے قدموں میں بچھادوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بجلی کے سوئچ کی طرف بڑھ گیا۔ کمرا نیم تاریکی میں ڈوب گیا۔ گرم سانسوں کی سرگوشی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ تیز پرفیوم نے اس کی حسِ شامہ کو ڈھانپ لیا۔ وہ آج بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اشرف سے لپٹتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ہنسلی کی ہڈیاں بہت نمایاں تھیں' بلکہ سارے جسم کی ہڈیاں ہی نمایاں تھیں' پھر بھی اس کے جسم میں کشش تھی۔

ایک گھنٹے بعد اشرف' رانو سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ اس نے پرسوں پھر آنے کا کہا تھا۔

لیکن اس کے بعد وہ رانو کو کبھی نہیں دیکھ سکا۔ وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی تھی۔ بہرحال اس بات کا پتا اشرف کو دو دن بعد لگا۔

گھر آکر بھی اشرف مسرور ہی رہا۔ اس نے امی کی الماری میں جو نقب لگائی تھی وہ ابھی تک راز تھی اور اشرف کو امید تھی کہ کافی دنوں تک راز ہی رہے گی۔ امی الماری کا وہ خانہ بہت کم کھولتی تھیں۔ اگلا دن اشرف نے بڑی مصیبت سے کاٹا' تیسرے روز اتوار تھا۔ اس نے پہلے "بارہ سے تین" فلم کا پہلا شو دیکھا' پھر تانگے کی سیر کرتا رانو کی طرف روانہ ہو گیا۔ "اس بازار" میں داخل ہو کر وہ ارد گرد کم ہی دیکھتا تھا' سیدھا رانو کے دروازے پر جاکر رکتا تھا۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دروازے پر ایک تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر ایک میلے کچیلے ہوٹل میں جا بیٹھا اور ڈش دیکھتا رہا۔ ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے اس نے رانو کی کوٹھڑی کے دو چکر لگائے لیکن تالا بدستور موجود تھا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مختلف چوباروں سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں' وہ مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔

اگلے روز وہ پھر رانو کے دروازے پر پہنچا۔ آج بھی اس کا استقبال رانو کے بجائے تالے نے ہی کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے واپس جاکر اس بات کا ذکر طوطے سے بھی کیا۔ طوطا یوں تو بہت گھاگ تھا مگر بازارِ حسن کے معاملات کے متعلق اسے بھی کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔ اشرف نے تین دن اسی طرح بازارِ حسن کے چکر لگائے۔ چوتھے دن وہ وہاں پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر ایک بھرے بھرے جسم کی عورت بناؤ سنگھار کئے بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ پان سے رنگے ہوئے تھے۔

اشرف کو دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر اس نے پہلے تو اشرف کو آنکھ ماری لیکن جب دیکھا کہ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا تو بولی۔ "کیا بات ہے لونڈے۔ کیا دیکھ رہا ہے؟"

"وہ.......... وہ یہاں۔ پہلے.........." وہ ہکلایا۔

"اچھا تو تُو اس پہلے والی کا عاشق ہے۔ بچہ جی' وہ تو یہاں سے پھُر ہو گئی' یعنی اڑ گئی۔ اب تو اس کی جگہ میں ہوں۔ کہو کیا خدمت کروں؟"

"کہاں گئی وہ؟"

"بس دفع ہو گئی حرام زادی۔ پتا نہیں کہاں گئی۔"

"کیا کسی سے جھگڑا ہوا تھا' اس کا؟" اشرف نے ہمت کر کے پوچھا۔

"کوئی ایک جھگڑا تھا۔ بندے بندے کا تو ادھار دینا تھا حرام زادی نے۔ بڑی ٹھگ باز تھی۔ کہیں تیرے ساتھ تو کوئی ہینگی بینگی نہیں کی۔"

"نن۔ نہیں تو۔"

"چل پھر جا کر دربار پر تیل ڈال۔ تیرے جیسے بچونگڑے کو تو اس نے ضرور تھوک لگا دینا تھا۔"

اشرف کے کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ اس بھدی عورت کی کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ رانو ایسی نہیں تھی۔ وہ تو اس سے بڑی محبت کرتی تھی۔ وہ ضرور یہیں کہیں ہو گی۔ شاید اس نے اپنا ٹھکانا بدل لیا ہو۔ کسی وجہ سے اچانک اسے کوئی دوسری کوٹھری ڈھونڈنی پڑ گئی ہو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ان سیلن زدہ گلیوں میں رانو کو ڈھونڈنے لگا۔

☆========☆========☆

پورا ایک ہفتہ اشرف اسی طرح رانو کی تلاش میں سرگرداں رہا پھر پھولوں کے ہار بیچنے والے ایک شخص سے اسے مرجان کا پتا بھی چل گیا۔ وہ اس مرجان نامی شخص کے پاس پہنچا۔ وہ بازار کی ایک ذیلی سڑک پر سری پائے بیچتا تھا اور دیگی چرغہ بناتا تھا۔ ہار بیچنے والے نے مرجان نامی اس شخص کو اشرف کا مسئلہ بتایا۔

مرجان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "کتنے کا ٹیکا لگایا ہے اس کتیا نے تجھے؟"

"نن.......... نو ہزار۔" اشرف نے اسے پانچ ہزار کم کر کے بتائے۔ شاید وہ اس طرح اپنی شخصیت میں بے وقوفی کا "لیول" ذرا نیچے لانا چاہتا تھا۔

"تیرا ایک بھائی بند اور بھی یہاں موجود ہے۔" مرجان نے سالن میں چمچہ گھماتے ہوئے کہا' پھر وہ اپنے نو عمر ملازم سے بولا۔ "اوئے چھیدے! جا اس لمڈے رنگ الٰہی کو بلا کر لا۔"

دو منٹ بعد لمبے قد کا ایک دیہاتی لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شکل و صورت سے کسی کاشت کار یا زمیں دار کا باغی بیٹا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر مرجان نے کہا۔ "اوئے لمڈے! دیکھ تیرے ساتھ کا ایک اور شکار آیا ہے' اسے اپنی کہانی سنا۔"

وہیں لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر اس دیہاتی لڑکے نے جو کچھ اشرف کو بتایا' اس نے اشرف کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ لڑکے کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی رانو کے پاس جاتا تھا۔ رانو نے اس لڑکے کے ساتھ بھی وہی اشرف والا ڈراما کیا تھا۔ اسی طرح پہلے اس سے ملنے سے انکار کیا تھا' پھر اسے مرجان خاں والی پٹا سنائی تھی اور آخر میں اس سے چھ سات ہزار روپے اینٹھے تھے۔

اشرف کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو تیر گئے۔ اس نے پورے چودہ ہزار روپے کا دھوکا کھایا تھا اور یہ چودہ ہزار روپے اس نے جس طرح اکٹھے کئے تھے' کچھ وہی جانتا تھا۔ اس نے اپنی آپا کے زیور بیچے تھے۔ اپنی نہایت پیار کرنے والی ماں اور آپا کو سنگین دھوکا دیا تھا۔ یہ دکھ اپنی جگہ حقیقت تھے اور اس کے ساتھ رانو کی دغا بازی اور جدائی کا دکھ بھی حقیقت تھا۔ ایک دم اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ایک تیز سیلابی پانی میں ہو اور اس کی کشتی کے دونوں پتوار ٹوٹ گئے ہوں۔ آنسوؤں کی نمی نے اس کی آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تان دی تھی۔ اسے لگا جیسے اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو اسے پیار دے سکے' اس کے اندر کی اتھل پتھل کو سمجھ سکے۔ سب نے اسے دھکے ہی دیئے تھے۔ تارا' نشاط' رانو۔ سب نے اسے دھتکارا تھا اور اس کی اس بے عزتی کا سبب کون تھا۔ شاید ارمان۔ وہ اس کے سراپا میں ایک ایسی حرارت جگا گئی تھی جس نے اسے وقت سے پہلے ہی چٹخا کر جوان کر دیا تھا۔ اب وہ بچے کی حیثیت سے شفقت کا مستحق تھا نہ بالغ کی حیثیت سے محبت کا۔ بے وقت کی آگہی نے اسے ہر رعایت سے محروم کر دیا تھا۔

ابھی وہ بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دو پولیس موبائلز تیزی سے وہاں آ کر رکیں'

اس کے ساتھ ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جھروکے اور دروازے بند ہو گئے۔ گلی میں مٹر گشت کرنے والے تماش بینوں کے جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلے۔ "اوئے بھاگ جاؤ۔ چھاپا پڑ گیا ہے۔" مرجان خاں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اٹھ کر بھاگے۔ رنگ الٰہی نامی نوجوان تو چند گز آگے جا کر ہی پکڑا گیا۔ اشرف تیزی سے دوڑ کر ایک دروازے میں گھس گیا لیکن ابھی وہ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں چڑھا پایا تھا کہ دو پولیس والے دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آئے۔ بید کی چھڑی کی چند زور دار ضربیں اشرف کی ٹانگوں اور کمر پر لگیں۔ ایک ہٹے کٹے پولیس والے نے اسے بالوں سے پکڑا اور بے دردی سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ دوسرا پولیس والا گالیاں دے رہا تھا اور اشرف کے کولہوں پر چھڑی سے ضربیں لگا رہا تھا۔ اسے قربانی کے جانور کی طرح گھسیٹ کر پولیس موبائل میں پھینک دیا گیا۔ دوسری موبائل میں کسبی طوائفوں کو بھرا جا رہا تھا۔ ان میں سے کئی ایک پولیس والوں کی منتیں کر رہی تھیں' پولیس والے انہیں گندی گالیاں دے رہے تھے۔

☆=========☆=========☆

طوائفوں کے محلے سے اشرف کے پکڑے جانے کی خبر تارا پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اس نے تو ہر نماز کے بعد اشرف کی بہتری اور اس کے سدھار کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی دعاؤں کے اثر کو کیا ہو گیا تھا۔ تارا کے گھرانے اور پھپو کے گھرانے کے سوا اشرف کے پکڑے جانے کی خبر کسی کو نہیں تھی۔

اشرف کی امی اور آپا نے بھی رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ دوسری طرف اشرف کے ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اشرف کی ضمانت کرانے تھانے نہیں جائیں گے اور نہ کسی اور کو جانے دیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس بدبخت کو اس کے کئے کی قرار واقعی سزا ملنی چاہئے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ پولیس والوں کی مار کھا کر اشرف نے اس چوری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا جو اس نے چند روز پہلے گھر میں کی تھی۔ اس نے اپنی آپا کے بندے اور انگوٹھیاں سُوہا بازار میں بیچی تھیں اور چودہ ہزار روپے ایک طوائف کی نذر کر دیئے تھے۔ تارا کے گھر میں کسی کو یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ چودہ پندرہ سال کا اشرف اتنے "بڑے بڑے" کام کر رہا ہے۔

ایک دن اشرف کی امی یعنی تارا کی پھپو ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اپنے بھائی

کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "ارشاد! تم ہی کچھ کرو۔ اس بدنصیب کو تھانے سے چھڑا لاؤ۔ عارفہ کے ابا نے تو قسم کھائی ہے کہ وہ دو سال بھی وہاں سڑتا رہے تو اس کی خبر نہیں لیں گے۔"

تارا کے ابو نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بڑی آپا! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں تک اشرف گھر آ جائے گا۔"

"تم اسے تھانے میں مل کر آئے ہو؟"

"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"مجھے پتا ہے تم مجھے تسلیاں دے رہے ہو۔ انہوں نے اسے بہت مارا ہو گا۔ انہوں نے مارا ہے تو اس نے چوری بتائی ہے نا۔"

"بڑی آپا! وہ کوئی پکا چور تھوڑی تھا۔ انہوں نے دو چار تھپڑ مارے اس نے بک دیا۔ میں اسے خود دیکھ کر آیا ہوں' وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن.........."

"لیکن کیا؟" اشرف کی امی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"اشرف پرسوں تک انشاء اللہ گھر تو آ جائے گا' مگر اس کے بعد معاملہ سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ بھائی جان (اشرف کے والد) اس سے سختی سے پیش آئیں گے۔ یہ نہ ہو کہ وہ گھر سے ہی بھاگ جائے۔"

"میں سب سنبھال لوں گی۔ بس میرے ویر! ایک بار تم اسے گھر لے آؤ۔" اشرف کی امی نے روتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دن کے لئے اسے اپنے گھر ہی لے آؤں مگر پھر بھائی جان کی ناراضگی کا خیال آ جاتا ہے۔" تارا کے ابو نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں ابھی اسے گھر ہی آنے دو' پھر دیکھ لیں گے۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں' تارا کے ہونٹ مسلسل دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔

☆=========☆=========☆

پانچویں دن عدالت سے اشرف کی ضمانت ہو گئی۔ پولیس والوں نے اسے ٹھیک ٹھاک مار لگائی تھی' اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اب ایک نیا امتحان اس کے سامنے تھا۔

اسے گھر والوں کا اور خاص طور سے ابا جان کا سامنا کرنا تھا۔ ماموں جان نے سارے راستے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ان کی ہمیشہ مہربان نظر آنے والی آنکھوں میں دکھ اور غصے کی جھلک اتنی نمایاں تھی کہ وہ دوبارہ ان کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا۔ راستے میں انہوں نے بس ایک فقرہ کہا تھا۔ "اشرف! تم نے ہم سب کے سر شرم سے جھکا دیے ہیں۔"

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اشرف کو لے کر اس کے ابا جان کے سامنے جاتا' مگر ماموں نے یہ ہمت بھی کی۔ اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر ابا جان کے تھپڑ جو اشرف کے گالوں پر پڑنے تھے ماموں نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر کھائے تھے۔ غالباً آج بھی وہ اس قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار تھے.......... مگر غیر متوقع طور پر ایسی صورت حال پیش نہیں آئی۔ ابا جان کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ تھا مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا' اور ماموں جان سے "ضمانت" کے بارے میں چند ایک سوال پوچھ کر نماز پڑھنے مسجد میں چلے گئے۔

ماموں جان بھی کچھ دیر ان کے گھر ٹھہر کر اپنے گھر چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اشرف کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابا جان گھر واپس آئے اور انہوں نے کمرے میں بند کر کے اشرف پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ اشرف کے ناک منہ سے خون بہنے لگا۔ ابا جان نے دھاڑتے ہوئے اشرف کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے بیرونی دروازے پر لے آئے۔ اسے چھڑانے کی کوشش میں آپا عارفہ کی ساری چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ گر پڑیں۔ اشرف کی امی اپنے کمرے میں ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب ابا جان نے شدید غم وغصے کے عالم میں اشرف کو گھر کی دہلیز سے باہر دھکا دیا' عین اس وقت اشرف کے سینے میں بغاوت کی ننھی سی چنگاری چمکی۔ اس نے سوچا' ٹھیک ہے اگر گھر والے اسے گھر میں رکھنا نہیں چاہتے تو وہ گھر میں نہیں رہے گا۔ ہاں........... وہ نہیں رہے گا گھر میں۔

گھر بدر ہونے کے بعد اشرف سیدھا طوطے کے گھر پہنچا تھا۔ اس نے طوطے سے کچھ روپے ادھار لئے اور ملتان چلا گیا۔ ملتان میں وہ کوئی دس دن رہا' جب پیسے ختم ہونے لگے تو اسے واپس لاہور آنا پڑا۔ لاہور آکر وہ گھر نہیں گیا بلکہ سیدھا طوطے کے پاس پہنچا۔ طوطے نے اسے بتایا کہ وہ اس کی رہائش کا انتظام ورکشاپ میں کر چکا ہے۔ وہ استاد جیدے کے ساتھ ورکشاپ میں رہ سکتا ہے اور اگر چاہے تو اپنے جیب خرچ کے لئے

ورکشاپ میں تھوڑا بہت کام بھی کر سکتا ہے۔

اشرف ورکشاپ میں استاد جیدے کے پاس چلا گیا۔ وہاں اس نے اخبار دیکھا تو پتا چلا کہ یہ مارچ کی دس تاریخ ہے۔ اس کو جھٹکا سا لگا۔ اسکول میں نویں کلاس کے امتحان شروع ہوئے پانچ روز ہو چکے تھے۔ اسکول میں اس کے ساتھ پڑھنے والے لڑکے یقیناً صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس امتحان دے رہے تھے مگر وہ امتحانات اور اسکول وغیرہ سے بہت دور جا چکا تھا۔ خستہ حال کپڑے پہنے وہ ایک ورکشاپ کے اندر بیٹھا تھا پھر اس نے سوچا' چلو اچھا ہی ہوا کہ وہ امتحان دینے والے لڑکوں میں شامل نہیں۔ اس امتحان کا نتیجہ' بری طرح فیل ہونے کے سوا اور کچھ نہیں نکلنا تھا۔ غم غلط کرنے کے لئے اس نے استاد جیدے کا ٹی وی آن کیا اور ایک سستے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ ہر کش کے ساتھ اس کو اپنے سینے میں آگ سی اترتی محسوس ہوتی تھی۔

ایک روز ایک چادر پوش عورت ورکشاپ پہنچی۔ اشرف اس وقت ملیشیا کے کپڑے پہنے ایک خراب گاڑی کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ چادر پوش عورت اشرف کی امی تھیں۔ انہوں نے اشرف کو سینے سے لگا لیا اور دیر تک زار و قطار روتی رہیں۔ پھر اس نے کہا۔ "اشرف! چل میرے ساتھ گھر چل۔ اپنے ابا جان کے پاؤں پکڑ لے۔ وہ تیرے باپ ہیں۔ وہ تجھے معاف کر دیں گے۔"

اس سے پہلے ایسی باتوں کے جواب میں وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا تھا' لیکن اب حوالاتیوں میں چند دن گزار کر اور ملتان کی سیر کر کے اس کے اندر تھوڑی سی سرکشی پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ ناپسندیدہ بات کا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "نہیں امی! میں گھر نہیں جاؤں گا۔ ابا جان کو میری شکل ہی اچھی نہیں لگتی' میں گیا تو وہ پھر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیں گے۔"

اشرف کی امی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح جواب دے گا۔ انہوں نے روہانسی آواز میں کہا۔ "اشرف! تو تو ایسا نہیں تھا۔ یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "امی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ یہاں میں بہت خوش ہوں۔ بس آپ کا دل چاہے تو کبھی یہاں آکر مجھے مل لیا کریں۔"

"بکواس بند کر۔ میں تجھے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"اگر آپ زیادہ سختی کریں گی تو پھر میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا پھر آپ ڈھونڈتی رہیں گی مجھے۔" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ اس کی امی سکتے کی سی حالت میں رہ گئی تھیں۔ اشرف نے مزید کہا۔ "اور ماموں جان کو بھی سمجھا دیں کہ وہ یہاں نہ آئیں۔ وہ مجبور کر کے لے بھی جائیں گے تو میں گھر میں رہوں گا نہیں۔"

امی روتی ہوئی واپس چلی گئی تھیں۔ اشرف کو اندیشہ تھا کہ اور کوئی آئے نہ آئے مگر ماموں اس کے پیچھے ضرور آئیں گے مگر آٹھ دس دن گزر گئے' اس کا اندیشہ سچ ثابت نہیں ہوا' ایک دن جہانگیر ورکشاپ میں آیا' اس کی زبانی اشرف کو پتا چلا کہ ماموں تو اسپتال میں ہیں۔ ان کے اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ان کے سینے میں چوٹ آئی ہے۔

اشرف کو افسوس تو بہت ہوا مگر اس کے ساتھ یہ تسلی بھی ہوئی کہ اب ماموں اس کے پیچھے یہاں ورکشاپ میں نہیں آئیں گے۔

ورکشاپ میں اشرف کے دن مزے سے گزرنے لگے۔ استاد جیدے کے پاس اس کی حیثیت شاگرد کاریگر کی تھی۔ جیدا شام کو بیس پچیس روپے اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ یہ پیسے سگریٹ اور دو وقت کے کھانے کے لئے کافی تھے۔ دوپہر کا کھانا استاد کے ذمے تھا۔ اکثر وہ رات کے کھانے میں بھی استاد کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ دو ہفتے پہلے استاد نے ایک اور ڈش لگائی تھی۔ یہ ڈش تھائی لینڈ' چین' روس اور پتا نہیں کون کون سے ملک پکڑتی تھی۔ تین ڈشوں کے ملا کر دو سو سے زیادہ چینل بن جاتے تھے۔ ان میں ایسے ایسے چینل بھی تھے کہ بندہ دیکھے تو نیند اڑ جائے۔ ہیرا منڈی کی جسم فروش عورت رانو' اشرف کی زندگی سے دفع ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی کسی وقت اسے یاد آجاتی تھی۔ اس کے کچے ذہن پر اس کے غلیظ قدموں نے گہرے نشان چھوڑے تھے۔ ایک رات جب وہ ایسے ہی گم صم بیٹھا تھا' استاد جیدے نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"چھوٹے! ذرا ٹانگیں دبا میری۔" استاد نے نشیلے لہجے میں کہا۔

وہ ٹانگیں دبانے لگا۔ استاد جیدے نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اوئے! گم صم کیوں ہے۔ کہیں وہ "بڑے بازار" کی فراڈن تو یاد نہیں آرہی؟"

طوطا استاد کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ بولا "یہ تو نہیں مانے گا' لیکن بات یہی ہے استاد۔ وہ اس کو ناکام ہیرو بنا گئی ہے۔ پہلے دن میں چار پانچ سگریٹ پیتا تھا اب پوری دو

ڈبیاں پینے لگا ہے۔"

استاد جیدے نے کہا۔ "پاگلو! سگریٹ سے غم ہلکا تو ہو جاتا ہو گا لیکن بھاگتا نہیں ہے۔ غم کو بھگانا ہو تو پھر یہ پیئو۔"

اس نے پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر انڈین شراب کی کوارٹر بوتل نکال لی۔

وہ پہلا دن تھا جب اشرف نے استاد جیدے کے اصرار پر ام الخبائث کو پہلی بار منہ سے لگایا۔ پندرہ سال کی عمر میں پہلا گھونٹ اس کے اندر گیا۔ نازک سا تو اندر تھا' جیسے کسی نے چیر کر رکھ دیا۔ وہ کتنی دیر کھانستا رہا۔ استاد جیدا اور طوطا ہنستے رہے۔ طوطا خود بھی کبھی کبھار ایک دو گھونٹ لگا لیتا تھا۔ اسے خوشی ہوئی کہ اشرف بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا ہے۔

دن گزرتے رہے۔ اشرف کی امی وقتاً فوقتاً آتی رہیں۔ وہ اسپتال سے ماموں ارشاد کے دو تین پیغام بھی لے کر آئیں۔ ماموں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسپتال میں آکر ان سے ملے۔ اشرف ہر مرتبہ ماں سے وعدہ کرتا رہا مگر گیا ایک بار بھی نہیں۔ اس کی زندگی کا رخ مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ اس کا قد اب ساڑھے پانچ فٹ کے قریب ہو گیا تھا۔ بالائی ہونٹ پر سیاہی مائل مونچھیں نظر آنے لگی تھیں۔ اس کے ارد گرد لچر فلموں اور لوفر دوستوں کی بھرمار تھی۔ پہلے گھر والوں کی فکر تھی' اب وہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ وہ راتوں کو آوارہ گردی کرتا اور کبھی کبھی طوطے کے ساتھ بازار حسن بھی جا پہنچتا۔ رانو اب وہاں نہیں تھی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اشرف کو معلوم ہو گیا تھا کہ جیب میں پیسے ہوں تو اس بازار سے ہر قسم کا مال خریدا جا سکتا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اسے خرید و فروخت کے سارے داؤ پیچ آگئے تھے بلکہ اس معاملے میں تو طوطے جیسے گھاگ نے بھی اسے اپنا استاد مان لیا تھا۔ ایک دن وہ دونوں بازارِ حسن کی ایک گلی میں گشتی پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بھی بچے لیکن اس قسم کے واقعات اب اشرف پر زیادہ اثر نہیں کرتے تھے۔

وہ ہفتے کی ایک نسبتاً گرم شام تھی۔ اشرف اور طوطے کو ہفتہ وار پیسے ملے تھے۔ انہوں نے اُس بازار میں جانے کی ٹھانی جہاں کھڑکیوں اور جھروکوں میں عورت بکتی ہے۔ وہ دونوں جیل روڈ سے خراماں خراماں مزنگ چونگی کی طرف چلے جا رہے تھے' ایک جگہ انہیں ایک صاحب نظر آئے' انہوں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا رکھا تھا اور سیلف پر سیلف

مارے جا رہے تھے۔ طوطے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی' بولا۔ "چل آ' صاحب کو گاڑی اسٹارٹ کر دیں۔ بیس تیس روپے کا جیک لگ جائے گا۔"

وہ دونوں پسینہ پسینہ صاحب کے پاس پہنچے۔ طوطے نے اسے بتایا کہ وہ موٹر مکینک ہے۔ پریشان حال صاحب نے فوراً گاڑی کی چابی طوطے کی طرف بڑھا دی۔ طوطے نے سیلف مار کر دیکھا پھر ماہرانہ انداز میں انجن سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ آدھا گھنٹا لگ گیا۔ گاڑی نے اسٹارٹ تو کیا ہونا تھا۔ اس کی فیول لائن بھی کہیں سے "لیک" کر گئی اور پٹرول ٹپکنے لگا۔ اب طوطے کو پسینے آ رہے تھے اور صاحب جھلایا ہوا تھا۔ طوطے نے بمشکل پٹرول کا اخراج روکا اور اشرف کو گاڑی کے نیچے گھس کر دو نٹ کسنے کا حکم دیا۔

اشرف نٹ کسنے کے لئے نیچے گھسا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ ایک پرائیویٹ اسپتال کا گیٹ بالکل سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک منظر پر پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے ماموں ارشاد کو دیکھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسپتال سے باہر آ رہے تھے۔ ایک طرف سے ممانی اور دوسری طرف سے تارا نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کے عقب میں اشرف کے ابا جان تھے۔ ساتھ ہی آپا تھیں جنہوں نے ٹوکریاں وغیرہ اٹھا رکھی تھیں۔ کچھ سامان چچا رشید نے اٹھایا ہوا تھا۔ اشرف کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ماموں ارشاد اس اسپتال میں زیر علاج تھے اور اب فارغ ہو کر گھر جا رہے ہیں۔

وہ گاڑی کے نیچے کچھ اور بھی دبک گیا۔ اس کی نگاہ تارا پر پڑی۔ آدھے بازو کی پھولدار قمیص میں وہ دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا......... وہ چلتے ہوئے اشرف کے ابا جان سے کوئی بات بھی کر رہی تھی۔ اس کی مدھم میٹھی آواز اشرف کے کانوں تک پہنچی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ اشرف سے صرف چند قدم کی دوری پر وہ لوگ ٹھہر گئے اور اپنا سامان کار میں رکھنے لگے۔ اشرف نٹ کسنے کے لئے نیچے گھسا تھا اور چابی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ باہر "صاحب" سخت جھلایا ہوا تھا۔ اس نے اشرف کو باقاعدہ گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اب وہاں نیچے کس ماں کی فاتحہ پڑھنے لگ گئے ہو؟"

"بس صاحب جی! ایک نٹ رہ گیا ہے۔" اشرف نے مری مری آواز میں کہا۔

دراصل وہ اس انتظار میں تھا کہ اس کے گھر والے وہاں سے جائیں اور وہ باہر

نکلے۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور اشرف پسینے پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل ایک دم بہت اداس اور بیزار ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے ارد گرد کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے طوطے کے ساتھ بازار حسن جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ وہیں مزنگ چونگی سے نان تکے کھا کر وہ لوگ ورکشاپ واپس آ گئے۔

اس رات طوطے کے منع کرنے کے باوجود اشرف نے "کم قیمت" دیسی شراب کی آدھی کپی چڑھا لی اور مدہوش ہو کر واہی تباہی بولتا رہا۔ نشے میں اسے کمرے کی دیواریں سرخ نظر آ رہی تھیں۔ یہ وہی رنگ تھا جو تارا کی آدھی آستینوں والی قمیض کا تھا۔ اس قمیض پر خوبصورت سفید پھول تھے۔ تارا کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ "اشرف! تم کتنی گہرائی میں گر گئے۔ تم نے مجھے کھو دیا اشرف......... تم نے کھو دیا۔"

پتا نہیں کیوں اس رات تارا اسے بڑی شدت سے یاد آئی۔ شاید جو چیز انسان کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہے' وہی اسے مطلوب ہوتی ہے۔ وہ اس فاصلے کو ناپتا رہا جو اس کے اور تارا کے درمیان پیدا ہو چکا تھا' اس کا دل روتا رہا۔

صبح وہ اٹھا تو تیز بخار تھا۔ رات کو کھانسی بھی معمول سے زیادہ ہوئی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آج سارا دن بستر پر پڑا اینٹھتا رہتا لیکن آج تو اسے سفر پر روانہ ہونا تھا......... ایک لمبے سفر پر۔ وہ جانتا تھا کہ ماموں اسپتال سے گھر آ چکے ہیں اور چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔ اب انہوں نے یقیناً یہاں پہنچ جانا تھا۔ انہوں نے اشرف کو گھر چلنے کا حکم دینا تھا۔ اشرف نے کبھی ان کی بات نہیں ٹالی تھی' آج بھی ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ لاہور چھوڑ رہا تھا۔ اس کی منزل ملتان تھی۔ گھر بدر ہونے کے بعد اس نے ملتان میں نو دس روز گزارے تھے۔ وہاں اس کا ایک بڑا اچھا دوست بنا تھا۔ وہ اسی کے پاس جا رہا تھا۔

اس روز رات کو اشرف ملتان میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ملتان میں گرمی ویسے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دوست کی تلاش میں دیر تک مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا نام واجد تھا' سب اسے واجد بھائی کہتے تھے۔ وہ لوہے کی گرلیں وغیرہ بناتا تھا لیکن ساتھ ساتھ پنجابی اور اردو کی شاعری بھی کرتا تھا۔ لوہے کی گرلیں اور نرم و نازک شاعری دو متضاد چیزیں تھیں۔ مگر واجد بھائی کے ہاتھوں میں یکجا ہو گئی تھیں۔ واجد بھائی کی عمر پینتیس سال سے اوپر تھی۔ انہوں نے لمبے بال رکھے ہوئے

تھے۔ چند ماہ پہلے کی طرح اس بار بھی واجد بھائی نے اشرف کو اپنی ورکشاپ میں خوش آمدید کہا۔ پچھلی مرتبہ بھی وہ اشرف سے کہتے رہے تھے کہ وہ اِدھر اُدھر آوارہ اور بیکار پھرنے کے بجائے ان کی ورکشاپ میں کام شروع کر دے۔ اس وقت اشرف کا ذہن منتشر تھا' وہ واپس لاہور جانا چاہتا تھا مگر اب وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پکے ارادوں کے ساتھ آیا تھا۔ لہٰذا جب واجد بھائی نے اس سے کام کے بارے میں کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی واجد نے اسے ورکشاپ میں رہنے کی اجازت دے دی۔

☆==========☆==========☆

وقت گزرتا رہا۔ رات اور دن کے پنچھی اپنے سفید اور کالے پروں سے اڑتے ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ اور اسی طرح پورے چار برس گزر گئے۔ ان چار برسوں میں اشرف نے ایک بار بھی مڑ کر اپنے ماضی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ ملتان سے باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ واجد بھائی کام کے سلسلے میں کویت چلے گئے تھے۔ اب ان کا سب سے چھوٹا بھائی شاہد ورکشاپ چلاتا تھا۔ شاہد کی عمر اشرف سے دو تین سال ہی زیادہ ہو گی۔ وہ بھی موج میلہ کرنے والا لڑکا تھا۔ اس کی صورت میں اشرف کو ایک اچھا ساتھی مل گیا تھا۔

درحقیقت کچی عمر میں اشرف کے ذہن پر عورت کے حوالے سے جو پختہ نقش بنے تھے' انہوں نے اشرف کی کیمسٹری ہی بدل ڈالی تھی۔ عورت اس کی اٹل کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہمہ وقت عورت کے بارے میں ہی سوچتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ یہاں ملتان میں بھی اشرف کو ایک دو ایسے پکے ٹھکانے مل گئے تھے جہاں اس کے اندر کی پیاس بجھتی رہتی تھی۔ اس "کارِ بد" میں کبھی کبھی شاہد بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ استاد جیدے کی دی ہوئی سوغات یعنی "بوتل" بھی ابھی تک اشرف کی زندگی کا حصہ تھی۔ شروع میں تو اسے ملتان آ کر کافی دقت ہوئی تھی لیکن اب شاہد کے ساتھ مل کر وہ نشے پانی کا انتظام با آسانی کر لیتا تھا.......... اس طرح سگریٹ نوشی بھی اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اس کی یہی مصروفیات تھیں جن کے سبب اس کی صحت تیزی سے گری تھی۔ کھانسی تو خیر لاہور ہی میں شروع ہو گئی تھی' اب آدھے سر کا درد اور نزلہ بھی رہنے لگا تھا۔ شاید اس دائمی نزلے ہی کی وجہ سے اس عمر میں اس کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ زیادہ قد کاٹھ بھی نہیں نکال سکا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا

جیسے وہ ایک تناور درخت بننے والا پودا ہو لیکن کسی وجہ سے ابتدا میں ہی ٹھٹھر سکڑ کر رہ گیا ہو۔

ارمان اب بھی اس کی پسندیدہ ترین فلمی اداکارہ تھی۔ وہ اب عمر میں کچھ بڑی ہو گئی تھی لیکن اس سے بھی بڑی بڑی ہیروئنیں انڈسٹری میں موجود تھیں۔ ارمان نے اپنے وزن کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا اور ماہر میک اپ مین اس کے چہرے کو جوان دکھانے میں کامیاب تھے۔ ہیروئن آنے کے ساتھ ساتھ ارمان اب فلمیں پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کرتی تھی۔ ایک تازہ ترین فلم میں اس نے ایک نئے ہیرو کے ساتھ جو ہیجان خیز ڈانس کیا تھا' اس نے ارمان کی ابتدائی فلموں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اشرف نے یہ فلم تین بار دیکھی تھی۔

ارمان.......... اشرف کے دل پر بڑی گہری لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاس قریباً بیس ویڈیو کیسٹ ایسے تھے جن میں صرف ارمان کے ڈانس اوز بے باک سین تھے۔ اس کے علاوہ ارمان کی اکثر فلمیں بھی ویڈیو کیسٹس کی شکل میں اس کے پاس محفوظ تھیں۔ چند ماہ پہلے جب اشرف بہت بیمار ہو گیا تھا اور علاج کے لئے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی تو اس کے دوستوں نے اسے وی سی آر اور کیسٹس بیچنے کا مشورہ دیا تھا۔ اشرف نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کیسٹوں میں تو اس کی جان تھی۔

اشرف کی عمر اب بیس سال کے قریب تھی۔ یہ تو بہار کے آغاز کی عمر ہوتی ہے۔ خوشبودار' لہراتی ہوئی اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی مگر اشرف کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی عمر گزار چکا ہے۔ وہ روز بہ روز کمزور اور بیمار تر ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا' وہ پستی میں ہے اور مزید پستی کی طرف جا رہا ہے لیکن وہ خود کو روک نہیں سکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف گندگی تھی' وہ راتوں کو اپنے اندر سیال آگ انڈیلتا تھا۔ گندی گلیوں میں چلتا ہوا' گندے کمروں میں داخل ہوتا تھا اور گند کے ساتھ لیٹ جاتا تھا۔ وہ گند کو چومتا تھا' گند سے لپٹتا تھا۔ اس کے ہاتھ مردار کا لمس محسوس کرتے تھے اور اس کے نتھنوں میں ایک سڑاند سی بھر جاتی تھی لیکن کبھی کبھی پتا نہیں ایک عجیب سی بات بھی ہوتی تھی۔ گندگی سے الجھتے ہوئے اور اس سے لپٹتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک دم کسی کی یاد آتی تھی.......... رنگی گاؤں کی طویل دوپہر اور آم کے پیڑ تلے کھڑی ایک لڑکی.......... اشرف کو تازہ ہوا کا لمس محسوس ہوتا۔ اسے یوں لگتا جیسے سڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر میں سے

خوشبو کا جھونکا نکلا ہو یا کسی گندگی میں سے کنول کے پھول نے سر ابھارا ہو۔

پتا نہیں کہ وہ تارا کو بھولا تھا یا بھول کر بھی نہیں بھولا تھا؟ کبھی یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک اس کا چہرہ آسمانی برق کی طرح اشرف کی نگاہوں میں چمکتا تھا اور پھر تاریکی میں کھو جاتا تھا۔ چند مہینے پہلے کی ایک بات ابھی تک اشرف کے ذہن میں موجود تھی۔ اس دن شاہد اس کے ساتھ ہی ورکشاپ میں سویا تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے اشرف سے کہا تھا۔

"یار' تم رات کو نیند میں بڑبڑاتے رہے ہو اور کسی تارا کا نام لیتے رہے ہو۔"

اس انکشاف پر اشرف بھونچکا رہ گیا تھا اور اس نے بڑی مشکل سے بات گول کی تھی۔

اب وہ تنہائی میں کسی وقت تارا کے بارے میں سوچتا تھا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ واقعی آسمان کا تارا ہے اور وہ خود کسی گندی نالی میں رینگتا ہوا کیڑا۔ ان دونوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا' جتنا آسمان اور گندی نالی کے درمیان ہو سکتا ہے۔

اس دن کام زیادہ تھا۔ شاہد نے پندرہ بیس کھڑکیوں کا آرڈر لیا ہوا تھا اور یہ کام آج رات ہر صورت مکمل کرنا تھا۔ موسم بھی کافی ٹھنڈا تھا۔ اشرف ویلڈنگ پلانٹ کے ذریعے رات بارہ بجے تک آہنی گرلوں کے ڈیزائن جوڑتا رہا اور تھک کر چُور ہو گیا۔ صبح وہ اٹھا تو اسے شدید بخار تھا اور ساتھ ہی سانس کی شکایت بھی ہو چکی تھی۔ اسے جب بھی ایسی شکایت ہوتی تھی' گلے سے گیں گیں کی پریشان کن آواز نکلنے لگتی تھی۔ جب دوا کھاتا تھا تو جلد پر دانے سے نمودار ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا جب سخت تکلیف سے نجات پانے کے لئے اس نے دوا لینی شروع کی تو شدید خارش شروع ہو گئی۔ بخار بھی اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تین چار دن میں ہی اس کے جسم کی نمایاں ہڈیاں نمایاں تر ہو گئیں۔

ایک دن وہ تاریک کمرے میں پڑا درد سے کراہ رہا تھا کہ شاہد اندر داخل ہوا۔

"اشرف! تجھ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" وہ بولا۔

"کون ہے؟"

"ایک بڑی عمر کا آدمی ہے۔ ساتھ میں دو لڑکے ہیں۔ اچھے صحت مند ہیں۔ مجھے تو یہ لوگ لاہور کے لگتے ہیں۔"

اشرف ذرا سا چونکا۔ "تم نے نام نہیں پوچھا؟"

اس سے پہلے کہ شاہد جواب میں کچھ کہتا' دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "لو.......... میرا خیال ہے وہ اندر ہی آ گئے ہیں" شاہد نے گھبرا کر کہا۔

وہ تیزی سے واپس مڑا۔ اشرف نے ہمت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر ابھی وہ ٹھیک سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کی نظر ادھ کھلے دروازے سے باہر گئی اور وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ جس شخص کو خود سے آٹھ دس گز کی دوری پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے ماموں ارشاد تھے۔ ایک لمحے کے لئے تو اشرف کے دل میں آئی کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ مگر اتنی مہلت نہیں تھی اور نہ ہی شاید اس میں اتنی ہمت تھی.......... ماموں اندر داخل ہو گئے۔ ان کے عقب میں اشرف کے دو چچیرے بھائی' گوہر اور نعمان تھے۔ اشرف نے دیکھا۔ ماموں کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلک رہے تھے۔

☆=========☆=========☆

ماموں ارشاد' گوہر اور نعمان بیمار اشرف کس طرح ملتان سے لاہور لائے؟ لاہور میں اپنے بچھڑے ہوئے اہلِ خانہ سے اشرف کا آنسوؤں بھرا ملاپ کس طرح ہوا؟ ابا جان نے اسے کس طرح گلے لگایا؟ ماں نے کس طرح بلائیں لیں؟ یہ سب ایک طویل روداد تھی۔ مسلسل بیماری کے سبب اشرف کی خستہ حالت خستہ تر ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی ماموں ارشاد اسے ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور اس کا دوا دارو شروع ہو گیا تھا۔

پچھلے تین چار سالوں میں اس کے گھر والوں نے مسلسل اس کی تلاش جاری رکھی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ پورا پاکستان چھان مارا تھا۔ اخبارات میں اشتہار وغیرہ بھی آئے تھے۔ اشرف کی والدہ پیروں فقیروں سے دعائیں کرانے اور تعویذ وغیرہ لینے کے لئے دربدر بھٹکتی رہتی تھیں۔ اشرف کی تلاش ایک اخباری اشتہار کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی تھی۔ ملتان میں ایک پوسٹ مین نے یہ اشتہار دیکھا تھا اور اسے شک گزرا تھا کہ یہ لڑکا استاد واجد بھائی کی ورکشاپ پر کام کرتا ہے۔ اس نے لواحقین سے رابطہ کیا تھا اور نتیجے میں اشرف کے ماموں ملتان جا پہنچے تھے۔

چار سال پہلے اشرف پر چوری کا جو مقدمہ بنا تھا وہ بھی گھر والوں نے دے دلا کر ختم کر دیا تھا۔ اشرف کی غیر حاضری میں ہی اس کے بڑے بھائی کی شادی بھی ہوئی تھی اور وہ ایک ننھی سی بچی کا باپ تھا۔ تارا ایف ایس سی کا امتحان دے چکی تھی۔ اس نے میٹرک

بھی بڑے، اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اشرف اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ گلاب کے تازہ کھلے ہوئے پھول جیسی تھی۔ سرخ و سپید رنگت، گہری سیاہ آنکھیں، جن میں سچے موتیوں کی چمک تھی اور غیر معمولی گھنے بال۔ اشرف کی نگاہیں ایک لحظہ کے لئے اس سے ملی تھیں اور پھر خود بخود جھک گئی تھیں۔

اپنی والدہ سے اجازت لے کر ایک دن اشرف اپنے پرانے دوستوں جہانگیر اور طوطے وغیرہ سے بھی ملا۔ جہانگیر قدرے سدھر گیا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ الیکٹرانکس کی دکان پر جاتا تھا۔ اس کی خوبرو بھابی نشاط ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ دوسرا اس کے بطن میں تھا۔ نشاط کو دیکھ کر اشرف کا دل چاہا کہ وہ آج پھر اسے اپنا ہاتھ دکھائے اور اس سے پوچھے کہ زندگی کی لکیر کب تک اسے زندہ رہنے پر مجبور کرے گی۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اسے اس عذابِ مسلسل سے چھٹکارا مل جائے۔ اشرف طوطے سے بھی ملا۔ اشرف کی طرح اس کی بھی داڑھی مونچھ آچکی تھی۔ وہ اب غنڈوں کی طرح باقاعدہ سینہ پھلا کر چلتا تھا۔ اپنے روحانی استاد جیدے کے ساتھ مل کر اس نے بے راہ روی میں کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔

گھر والے اب اشرف پر بھرپور نگرانی "رکھ" رہے تھے۔ اور تو اور ابا جان بھی اب اسے روزانہ کچھ وقت دیتے تھے۔ یہ وقت انہوں نے شروع میں دیا ہوتا تو شاید نوبت یہاں تک پہنچتی ہی نہیں۔ وہ سب مل کر اشرف کو سدھارنا چاہتے تھے مگر اشرف کو لگتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ جو کچھ گہرائی تک اس کے اندر اتر چکا تھا، وہ اتنی جلدی تو اپنی جڑیں چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ان میں سے ایک جڑ "نشے" کی تھی۔ دوسری "عورت بازی" کی تیسری رندوں کی دوستی کی۔ اس طرح پتا نہیں کتنی ہی جڑیں تھیں۔ نشے کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔ اس کی طلب کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ ڈاکٹر کی سخت ممانعت کے باوجود، ماموں جان اور والدہ کو اس سلسلے میں تھوڑی سی رعایت دینا پڑی تھی۔ ماموں جان نے بڑی رازداری کے ساتھ نعمان سے بات کی تھی۔ نعمان نے اشرف کے یار جہانگیر سے کہا تھا اور وہ کہیں سے تین بوتلیں شراب کی اشرف کے لئے لے آیا تھا۔ اشرف نے ماموں سے وعدہ کیا تھا کہ ان تین بوتلوں کے ختم ہوتے ہوتے وہ اپنی عادت بھی ختم کر ڈالے گا۔ مگر اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے وعدے پر پوری طرح قائم رہ سکے گا۔

بہرحال وہ اپنے طور پر خود کو سنبھالنے کی مقدور بھر کوشش کر رہا تھا۔ دوا وقت پر کھاتا تھا۔ اپنے حلئے اور لباس وغیرہ کا خیال رکھ رہا تھا۔ ایک دن وہ ششدر رہ گیا۔ وہ کمرے میں نیم دراز ریڈیو سن رہا تھا کہ اس کی امی اس کے پاس آبیٹھیں۔ "اشرفی! ایک بڑی اہم بات کرنے آئی ہوں تیرے ساتھ۔"

"کہیں امی جان!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ریڈیو بند کر دیا۔

"اشرفی! تجھے پتا ہی ہے کہ تیرے ماموں تجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں، اور یہ پیار کوئی آج سے نہیں، اس وقت سے ہے جب تم دودھ پیتے تھے......... ہماری طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ تم پڑھو لکھو اور بڑے آدمی بنو۔ اب تمہاری حالت دیکھ کر جس طرح ہم کڑھتے ہیں، اسی طرح وہ بھی کڑھتے ہیں۔ اور یہ بات کوئی اکیلی ان کی نہیں، سارے گھر والوں کی ہے۔ تمہاری ممانی بلقیس، تارا، اصغر سب تمہارے بارے میں فکر مند رہتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد تارا ہمارے گھر بہت آتی جاتی رہی ہے۔ اس نے میرا اتنا خیال رکھا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھتی رہی ہے۔ آج میں تارا ہی کے متعلق تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" اشرف کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"تمہیں شاید پتا ہی ہو کہ بچپن میں تمہارے اور تارا کے رشتے کے بارے میں زبانی کلامی بات ہوئی تھی......... ہم نے کہا تھا کہ بچے بڑے ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔ مگر تم جس طرح "بڑے" ہوئے ہو تم جانتے ہی ہو۔ یقین کرو اشرفی! ہم سب کے دل روتے ہیں۔ اب ہم میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ ہم تارا کے ماں باپ سے تارا کا سوال کرتے لیکن خدا زندگی دے تمہارے ماموں کو، انہوں نے تم سے محبت کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے کل مجھ سے اس بارے میں خود بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ تمہارے لئے تارا کا رشتہ دینے کے لئے تیار ہیں۔"

اشرف کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اگلے دو تین روز اشرف کے لئے بڑے ہیجان خیز تھے۔ وہ تو اپنے طور پر تارا کو ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔ کہاں وہ پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی، کہاں وہ انڈر میٹرک۔ بدحال اور بیمار جو سو طرح کی علتوں کا شکار تھا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، وہ عین حقیقت تھا اور اس کے سامنے تھا۔ اگلے روز آپا عارفہ نے بڑی رازداری کے ساتھ اشرف کو بتایا تھا کہ اس رشتے

میں تارا کی بھی پوری پوری مرضی شامل ہے۔ آپا نے اشرف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکیوں کا دل بڑا اور طرح کا ہوتا ہے اشرفی۔ بس ایک بار جس کے نام کے ساتھ نام لگ جاتا ہے' اسے بھولتی نہیں ہیں۔"

اشرف نے منہ پر رومال رکھ کر کھانستے ہوئے کہا۔ "آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں آپا! مگر........."

"مگر کیا؟"

"یہ کوئی جوڑ تو نہیں ہے آپا۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے اس کے ساتھ......... پھر دیکھو' وہ اب بارہ کلاسیں پڑھ چکی ہے' میں نے میٹرک بھی نہیں کیا۔"

"وہ پڑھا لے گی تمہیں۔ اسے بڑا شوق ہے پڑھانے کا۔" آپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆=========☆=========☆

اگلے دو تین مہینے کے اندر حالات میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ اشرف کی صحت قدرے بہتر ہو گئی۔ وہ نشہ چھوڑنے کی بھی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ سگریٹ نوشی جو تین ڈبی روزانہ تک پہنچ چکی تھی' اب نصف ڈبی روزانہ رہ گئی۔ بہرحال اس کا جسم اب بھی منحنی تھا اور آنکھیں گہرائی میں اتری ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کے سفید بالوں کو رنگنا شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی نے اس کی مجموعی شکل و صورت کو بہتری دے دی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار ابا جان کے ساتھ چاولوں کے سیل ڈپو پر بھی چلا جاتا تھا لیکن اس کام میں اس کا دل کچھ جمتا نہیں تھا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاری زور شور سے ہو رہی تھی۔ آپا عارفہ' امی' بھائی' چچا رشید کی بیٹیاں' سب کے سب بازاروں کے چکر لگا رہے تھے......... ایک دو بار اشرف نے دور دور سے تارا کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کا حسین رنگ دیکھ کر اشرف کے جسم میں زندگی کی جوت جاگ گئی تھی۔ تاہم وہ کوشش کے باوجود تارا سے کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔

وہ تارا کے جذبہ ایثار اور محبت کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اشرف کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اشرف کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آج تک بس سرابوں کے پیچھے ہی بھاگتا رہا ہے۔ اس کی منزل تو وہی ٹھنڈے میٹھے صاف پانی کا چشمہ تھا جو اس کے بالکل قریب بہہ رہا تھا۔ بس اس نے یہ

کیا کہ اس چشمے کے پوری طرح پھوٹنے سے پہلے ہی اسے استعمال میں لانا چاہا اور نتیجے میں یہ حیات بخش پانی اس سے روٹھ گیا۔ اب وہ چشمہ اپنے پورے بہاؤ پر تھا اور اشرف کی پرانی نادانیوں اور بے صبریوں کو درگزر کر کے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

وہ اکتوبر کی ایک سہانی شام تھی۔ اشرف اور تارا کی شادی ہو گئی۔ ہر طرف خوشی ایک پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ مگر مستقبل قریب کے پردے میں ابھی کچھ اور بھی چھپا ہوا تھا۔ ماموں کے گھر سے اپنی دلہن لے کر اشرف رات گیارہ بجے کے قریب اپنے گھر واپس آیا۔ دلہن کی آمد پر گھر میں جو چھوٹی موٹی رسمیں ہوتی ہیں' وہ ادا کی جا رہی تھیں۔ تارا سرخ جوڑے میں گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کے گرد چمکتی لشکتی قہقہے بکھیرتی لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ اشرف کی بے تاب نگاہیں اس ہجوم کے اندر سے راستہ بنا کر تارا تک پہنچنا چاہ رہی تھیں۔ اسی اثنا میں اشرف کا چچا زاد بھائی نعمان اس کے قریب آیا اور سرگوشی کے سے لہجے میں بولا۔ "اشرف' تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"ذرا باہر آؤ۔"

اشرف لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہاں کسی کی فون کال تھی ریسیور میز پر رکھا تھا۔ اشرف نے ریسیور کان سے لگایا' دوسری طرف جہانگیر تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "اشرفی! طوطے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' میو اسپتال میں ہے۔ پتا نہیں بچتا بھی ہے یا نہیں......... وہ تمہیں بلا رہا ہے۔"

اشرف سناٹے میں رہ گیا۔ وہ طوطے اور اس جیسے دوسرے دوستوں سے دور ہو گیا تھا۔ طوطے کو اس نے شادی میں بھی نہیں بلایا تھا لیکن طوطے کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر اور یہ سن کر کہ وہ اسے بلا رہا ہے' اشرف کے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ کچھ بھی تھا آخر' اس نے اپنے اس دوست کے ساتھ طویل وقت گزارا تھا۔ اس نے نعمان کو ساتھ لیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر میو اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں کچھ اور جان پہچان والے لڑکے بھی موجود تھے۔ طوطے کو سر اور ٹانگوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اس کے لئے فوری خون کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں سات آٹھ بوتلیں تو فوری طور پر درکار تھیں۔ کئی لڑکے خون دینے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ اشرف کی اپنی صحت کافی کمزور تھی لیکن وہ بھی خون دینے کو تیار نظر آ رہا

تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خون دے نہیں سکا۔ اسپتال پہنچ کر یہ اڑتی اڑتی سی بات بھی اشرف کے کانوں تک پہنچی کہ طوطا کوئی چھوٹی موٹی واردات کر کے بھاگ رہا تھا۔

تارا دلہن بن کر خوش تھی۔ یہ سب کچھ اس کی دلی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ وہ مشرقی لڑکی تھی جو زندگی میں بس ایک بار محبت کرتی ہے اور اس نے اشرف سے کی تھی۔ ماضی بہت تلخ تھا لیکن حال قدرے بہتر نظر آ رہا تھا۔ لاہور واپس آنے کے بعد اشرف نے خود کو کافی حد تک سنبھالا تھا۔ شیشہ دکھائی کی رسم کے دوران میں اس نے چور نظروں سے اشرف کو دیکھا تھا۔ وہ کمزور تو اب بھی تھا لیکن اس کے چہرے سے پژمردگی اب کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

وہ دلہن بن کر اشرف کے گھر آ گئی تھی۔ رات گئے اسے پتا چلا تھا کہ اشرف کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موٹر سائیکل سے گر کر بری طرح زخمی ہوا ہے اور اسپتال میں ہے۔ اشرف اس کی خبر گیری کے لئے گیا تھا۔ وہ ساری رات واپس نہیں آسکا۔ صبح سویرے معلوم ہوا کہ اس کا دوست اسپتال میں چل بسا ہے۔

اگلا دن تجہیز و تکفین میں گزر گیا تھا۔ اشرف شام کے بعد ہی گھر واپس آیا۔ وہ غم زدہ اور نڈھال لگتا تھا۔ رات کو دونوں بستر پر پاس پاس لیٹے رہے۔ اشرف نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا، انگوٹھی بھی پہنائی تھی۔ دونوں بستر پر نیم دراز ہو گئے تو اشرف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔

اگلے تین چار روز بھی اسی طرح گزرے۔ تارا جانتی تھی کہ اشرف کے دل پر دوست کی اچانک موت کا بوجھ ہے۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہتی تھی تاکہ وہ جلد نارمل ہو سکے۔ اشرف کے بھائی جان چاہتے تھے کہ تارا اور اشرف دو چار دن کے لئے مری چلے جائیں مگر اشرف نے ٹال مٹول کر دی۔ جب پورے دو ہفتے اسی طرح گزر گئے تو تارا کو الجھن ہونے لگی۔ شادی کے بعد دلہن کے جو ارمان ہوتے ہیں، وہ تارا کے سینے میں مچل رہے تھے۔ اشرف کی قربت اس کی سانسوں کی آمدورفت کو تیز کر دیتی تھی اور اس کے بدن میں بے کلی کی لہر سی دوڑنے لگتی مگر اس کے جذبوں کی آنچ شاید اشرف تک پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اس کے دل میں وسوسے جاگنے لگے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اشرف کی دوری کی کوئی اور وجہ ہو، کہیں......... وہ تارا سے ماضی کی کسی بات کا بدلہ تو نہیں لے رہا تھا۔ پرانی باتیں تھیں لیکن ان کے وجود سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ

تارا نے اشرف کو اپنے قریب آنے پر بری طرح جھڑکا تھا۔ پھر ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ تارا کی امی نے غصے میں آکر اشرف کو طمانچہ دے مارا تھا۔ کہیں اشرف کے دل میں کسی ایسے واقعے کی گرہ تو نہیں پڑی ہوئی تھی۔

اس کی شادی کو تین ہفتے ہونے کو آئے تھے لیکن وہ ابھی تک پہلی رات کی دلہن ہی تھی۔ اس کی یہ حیثیت اسے بے تکلفی کی اجازت تو نہیں دیتی تھی پھر بھی ایک رات ہمت کر کے اس نے اپنی بانہیں اشرف کے گلے میں ڈال دیں۔ "کیا بات ہے، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟"

"کیوں، تم نے کوئی ناراض کرنے والی بات کی ہے؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

"کی تو ہے۔" وہ ذرا شوخی سے بولی۔ "آپ کی دلہن بنی بیٹھی ہوں۔"

"یہ تو......... تمہاری قربانی ہے۔"

"قربانی نہیں......... محبت۔" اس نے جرأت کر کے کہا۔

اشرف نے آہستگی کے ساتھ اس کی بانہیں اپنے گلے سے ہٹا دیں اور اس کے قریب ہی نیم دراز ہو گیا۔ وہ کسی گہری، بہت گہری سوچ میں نظر آتا تھا۔ وہ دونوں پاس پاس لیٹے رہے۔ ایک عورت کی حیثیت سے تارا کی حسیات بہت تیز تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اشرف خدانخواستہ اس سے بیزار نہیں ہے۔ اس کا قرب اشرف کو بھی بے چین کرتا ہے۔ اس کے سینے میں بھی خواہشیں مچلتی ہیں۔ مگر وہ جان بوجھ کر تارا کے ساتھ اپنی دوری برقرار رکھتا ہے اور یہی بات تارا کے لئے زیادہ الجھن پیدا کرتی تھی۔ وہ کیوں اسے بانہوں میں بھر نہیں لیتا۔ وہ ساری شدتیں جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہیں کیوں تارا کے تن من تک نہیں پہنچتیں؟ آخر کیوں؟

وہ کئی دن تک اپنے دولہا کو ریجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ کبھی کبھی اس کوشش میں ایک مشرقی دلہن کی حد سے آگے بھی نکل گئی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ تارا کو لگتا تھا کہ کوئی بہت بھاری، بہت ناقابل برداشت بوجھ ہے اشرف کے سینے پر جو دن رات اس کے دل کو کچلتا رہتا ہے۔ پھر ایک روز آدھی رات کے وقت تارا نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اشرف اس کے ساتھ بیڈ پر موجود نہیں تھا۔ باتھ روم کے اندر سے ٹوٹ پھوٹ کی عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اٹھی اور لپک کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ اس نے دیکھا کہ کشادہ باتھ روم میں ویڈیو کیسٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ درجنوں کیسٹس تھیں۔ ان میں

سے بہت سی اشرف نے فرش پر پٹخ کر توڑ دی تھیں۔

"اشرف یہ کیا کر رہے ہیں؟" تارا حیرت سے بولی۔

"اس حرام زادی کو جلا رہا ہوں۔ اس کو ختم کر رہا ہوں۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا اور اسی وقت تارا کو اندازہ ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔

"کس کو جلا رہے ہو؟"

"اس حرام زادی کو جس کی فلمیں ان کیسٹوں میں ہیں......... اسی کتیا نے میری زندگی برباد کی ہے" وہ پھنکارا۔

پھر اس نے بیسن کے قریب رکھا ہوا پلاسٹک کا گیلن اٹھایا اور اس میں موجود پٹرول ان کیسٹوں پر انڈیلنے لگا۔ تارا ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اشرف نے جیب سے ماچس نکالی اور دیا سلائی جلا کر کیسٹوں پر پھینک دی۔ باتھ روم میں شعلے رقص کرنے لگے۔ صابن دانی' تولیہ' شیونگ برش' پلاسٹک کی بالٹی اور اسی طرح کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں' آگ کی زد میں آئیں اور کیسٹوں کے ساتھ ہی جل گئیں۔

تارا رو رہی تھی اور لرز رہی تھی۔ اشرف نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے گلے سے لگایا۔ "مت رو تارا......... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تُو تو بڑی بہادر لڑکی ہے' تجھے نہیں رونا چاہیے۔ بالکل نہیں رونا چاہیے۔"

پھر تارا کو بستر پر بٹھا کر وہ گھر کی چھت پر چلا گیا اور ٹہلنے لگا۔ تارا سہمی ہوئی تھی۔

☆========☆========☆

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے نومبر کی اس سرد رات کو اور بھی یخ بستہ کر دیا تھا۔ اشرف نے پتلون پر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں مفلر تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال الجھے ہوئے تھے۔ آج اسے پھر بخار تھا۔ ناک کے اندر سوزش سی ہو گئی تھی اور بازوؤں ٹانگوں پر بھی الرجی کے سے آثار تھے۔ اس نے گھر سے روانہ ہوتے وقت دو پیگ لگا لئے تھے اور اب ٹھنڈی ہوا اس کی ترنگ میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ چلتا چلتا ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے رکا اور پتا نہیں کیوں خالی خالی نظروں سے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھنے لگا۔ ایک بھولی بسری آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ جہانگیر کی بھابی نشاط کی آواز تھی۔ "اشرف۔ تمہاری شادی کی لکیر بڑی ٹیڑھی میڑھی ہے......... خیر چھوڑو' یہ دیکھو'

یہ زحل کے ابھار کے نیچے جو چھوٹی چھوٹی لائنیں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھو گے۔"

اشرف کے سینے سے آہ سی نکلی اور آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس نے سوچا' شاید نشاط ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو شدید محبت دینے کی خواہش رکھتا تھا۔ اسے عمر بھر اپنی بانہوں میں بھر کر رکھنا چاہتا تھا لیکن......... آہ حالات نے اسے کن پستیوں میں گرایا تھا۔ وہ اشرف المخلوقات تو کیا اشرف بھی نہیں رہا تھا۔

اس نے چند سیکنڈ کھانسنے کے بعد زمین پر تھوکا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں آگے آگے بڑھ رہا تھا' اس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کے رگ و پے سخت ہو رہے تھے۔ مزنگ چونگی کے اسٹاپ سے وہ ویگن پر سوار ہوا اور گلبرگ نمبر دو پہنچ کر اتر گیا۔ اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ کسی وقت ہلکی سی پھوار بھی پڑنے لگتی تھی۔ وہ چند دن پہلے بھی اس علاقے میں آ چکا تھا۔ اس نے پورا سروے کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ قریباً تین فرلانگ پیدل چلنے کے بعد وہ ایک وسیع کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ کوٹھی کی باؤنڈری وال کافی اونچی تھی لیکن ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخیں باؤنڈری وال سے چھو رہی تھیں۔

دبلے پتلے جسم کا مالک اشرف آسانی سے درخت پر چڑھا اور پھر باؤنڈری وال سے چھلانگ لگا کر کوٹھی کے احاطے میں پہنچ گیا۔ اس کے پاس مکمل معلومات تھیں۔ اسے پتا تھا کہ کوٹھی کے دو پٹھان چوکیداروں میں سے ایک چھٹی پر ہے' دوسرا مین گیٹ پر تھا۔ اشرف دبے پاؤں اندرونی عمارت کے دروازے تک پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے سب سے مشکل مرحلہ طے کرنا ہے۔ اندرونی عمارت کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے یہ دروازہ کھلوانا تھا۔ اسے صحن میں کرکٹ کا ایک بیٹ پڑا نظر آیا۔ اس نے بیٹ کو ایک کھڑکی کی آہنی گرل سے ٹکرا ٹکرا مسلسل آواز پیدا کی۔ اس آواز کا نتیجہ حسب توقع ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد ایک اندرونی کمرے کی لائٹ روشن ہوئی اور پھر کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

اشرف خاموش رہا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے پھر کرکٹ بیٹ کی مدد سے ٹھک ٹھک شروع کر دی۔ بھاری آواز نے دو تین مرتبہ پھر پوچھا کہ کون ہے؟ اس کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اشرف کرکٹ بیٹ تھام کر تیار ہو گیا اور دروازے کے بالکل ساتھ لگ کر

کھڑا ہو گیا۔ کسی شخص نے اندر سے چٹخنی گرائی اور سر نکال کر باہر جھانکا۔ اس کا سر نکالنا اس کے سر پر قیامت توڑ گیا۔ کرکٹ بیٹ پوری قوت سے اشرف نے اس کے سر پر مارا تھا۔ مضروب ایک کراہ کے ساتھ نیچے گرا۔ اشرف نے بلا توقف دوسری ضرب اس کے سر پر لگائی "کھٹاک" کی تسلی بخش آواز آئی۔ مضروب ایک جھٹکے کے ساتھ تھوڑا سا اینٹھا اور ساکت ہو گیا۔ وہ اٹھائیس تیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی جیب سے موبائل فون لڑھک کر گر گیا تھا۔ اشرف نے فون بند کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "کون ہے باہر؟"

آواز سنتے ہی اشرف نے جیکٹ کے اندر سے بھرا ہوا ماؤزر نکال لیا۔ اس کے سینے میں سلگتی ہوئی آگ الاؤ بنتی جا رہی تھی۔ ایک فربہ اندام نوکرانی باہر آئی۔ اشرف نے ماؤزر اس کی طرف سیدھا کیا۔ "خبردار آواز نہ نکلے۔" وہ غرایا۔

نوکرانی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اشرف نے نوکرانی کو ایک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے دہشت زدہ نوکرانی کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی آواز نکالی تو وہ اس کی زندگی کی آخری آواز ہو گی۔

چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اور بے ہوش شخص کو گھسیٹ کر ایک دوسرے باتھ روم میں مقفل کرنے کے بعد اشرف بڑی آہستگی سے دوسری منزل پر پہنچا۔ یہ کوٹھی کم و بیش تین کنال میں واقع تھی۔ ممکن تھا کہ یہاں ایک دو مزید ملازم بھی موجود ہوں۔ مگر وہ تھے بھی تو یقیناً رات کے اس پہر گہری نیند سو رہے تھے۔ باہر اب بارش شروع ہو گئی تھی اور گاہے گاہے بادل بھی گرج رہے تھے۔ اشرف راہداری میں بچھے دبیز قالین پر چلتا وسطی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ چند دروازوں کے پاس کھڑا ہو کر سن گن لیتا رہا۔ ایک دروازے کے اندر سے اسے میوزک بجنے کی مدھم آواز آئی۔ ماؤزر پر اشرف کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ "آئی!" اندر سے ایک سریلی نسوانی آواز ابھری۔

پھر کسی نے دروازے کا بولٹ گرا کر دروازہ کھولا اور بغیر اس کی طرف دیکھے واپس چلی گئی۔ اشرف ماؤزر تھامے کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھولنے والی اس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی اور ہاتھوں کے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ "کہاں

چلے گئے تھے سویٹی!" اس نے اشرف کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

پھر اچانک اس کی نظر سامنے آئینے پر پڑی اور اشرف کو دیکھ کر وہ تیزی سے گھومی۔ اس کا منہ چیخ مارنے کے لئے کھلا تھا مگر اشرف کے ہاتھ میں ماؤزر اور آنکھوں میں وحشت دیکھ کر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

"خبردار.......... آواز نہیں نکلنی چاہئے۔" اشرف نے ماؤزر کی نال عین اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔

"ک ک.......... کون ہو تم؟" اس نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

اشرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ جو عورت اس کے سامنے کھڑی تھی وہ جواں سال ہی لگتی تھی۔ اس کا رنگ میدے کی طرح تھا۔ نقش خوبصورت اور جسم میں کشش تھی۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اشرف کی خاموشی نے اسے مزید دہشت زدہ کر دیا۔ "میں پوچھتی ہوں کک.......... کون ہو تم؟" وہ پھر ہکلائی۔

وہ بولا۔ "تم مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں تمہیں جانتا ہوں اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ تم فلم اسٹار ارمان ہو۔ پچھلے پندرہ سالوں سے تم نے اسکرین پر تہلکہ مچا رکھا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ پیچھے کھسکتے ہوئے بولی۔

اشرف کو شک گزرا کہ شاید وہ ٹیلی فون تک پہنچنا چاہ رہی ہے یا کسی گھنٹی وغیرہ کا خفیہ بٹن دبانا چاہ رہی ہے۔ "خبردار! اپنی جگہ کھڑی رہو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" وہ اتنی وحشت سے غرایا کہ وہ پتھر کا بت بن گئی اور اس کا رنگ برف کے مانند ہو گیا۔

اس وسیع خواب گاہ میں خوش گوار حرارت تھی۔ جہازی سائز کے بیش قیمت میوزک یونٹ پر کسی انڈین گانے کی دھن ہلکی آواز میں بج رہی تھی۔ خواب گاہ میں الکحل کی ہلکی سی بو بھی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک یہاں مے نوشی ہوتی رہی ہے۔ ایک طرف الماری میں بڑی خوبصورتی سے وہ درجنوں ایوارڈز سجائے گئے تھے جو ارمان نے پچھلے برسوں میں حاصل کئے تھے۔ سامنے دیوار پر ارمان کی ایک توبہ شکن تصویر تھی۔ رقص کا یہ ہیجان خیز انداز کسی تازہ فلم سے لیا گیا تھا۔ غالباً اس تصویر کے ذریعے ارمان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا جسم آج بھی ہو شربا

ہے۔

اشرف نے کہا۔ "اپنے جس سیکریٹری کے ساتھ تم اس کوٹھی میں بغیر شادی کے رہ رہی ہو۔ وہ اس وقت نیچے ایک باتھ روم میں بند ہے اور بے ہوش پڑا ہے۔ باقی ملازموں میں سے بھی اس وقت کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو میری گولی کا نشانہ بنے گا۔ لہٰذا کسی طرح کی بہادری نہ دکھانا۔ میں جانتا ہوں ایسی بہادریاں صرف فلموں میں چلتی ہیں۔"

وہ سہم کر بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ مسلسل کانپتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بولی۔ "دیکھو۔ اگر تمہیں پیسہ چاہئے تو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ تم نوجوان ہو، اس طرح اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو۔"

وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں جوان نظر آتا ہوں؟ ایسے ہوتے ہیں نوجوان؟ ایسے ہوتے ہیں؟" اس نے اپنی ٹھوڑی کو اپنے ہی ہاتھ میں پکڑ کر اپنا چہرہ ارمان کے سامنے کیا۔ "میں نوجوان نہیں ہوں.......... میں بیماریوں کا کھایا ہوا اور نشوں کا مارا ہوا بیس سالہ بوڑھا ہوں.......... ہاں، بیس سالہ بوڑھا ہوں میں.......... تم نے مجھ پر جوانی آنے ہی نہیں دی.......... بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل کیا ہے مجھے تم نے۔ اور میں ایک نہیں ہوں، میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہوں۔ اور پورے ملک میں بکھرا ہوا ہوں۔" وہ نشے میں تھا اور عجیب لہجے میں بول رہا تھا۔

"مم.......... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"تم اتنی انجان نہیں ہو، تم سب سمجھتی ہو۔ بہت خرانٹ ہو تم لیکن تمہاری ایکٹنگ کا کمال ہے کہ تمہارے چہرے پر بھی معصومیت رہتی ہے.......... تم نے پندرہ سال تک مجھ جیسے بے وقوفوں کی زندگیاں برباد کی ہیں۔ تم اور تمہارے جیسی دوسری فلمی پریاں ہمیں اپنا دیوانہ بناتی ہیں۔ اپنے نخروں اور اپنی اداؤں سے ہمارے اندر آگ بھڑکاتی ہیں۔ پھر خود تو اونچی دیواروں کے پیچھے جا کر چھپ جاتی ہیں اور اپنے چاروں طرف گارڈز کا پہرا بٹھا لیتی ہیں۔ ہم اپنے آپ سے ٹکراتے ہیں، اپنے اردگرد سے ٹکراتے ہیں۔ تارا جیسی لڑکیاں ہمارے نشانے پر آجاتی ہیں۔ تمہاری بھڑکائی ہوئی آگ کہاں کہاں آگ لگاتی ہے، تمہیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"یہ.......... یہ تارا کون ہے؟" ارمان نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"خبردار.......... خبردار کتیا! اس معصوم کا نام نہ آئے تیری ناپاک زبان پر.......... اس کا نام نہ آئے۔ تو اس کی خوشیوں کی بھی قاتل ہے۔" اشرف نے جنونی انداز میں کہا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا ماؤزر ارمان کی کنپٹی سے لگا دیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ حالات کی شدید ترین سنگینی کو پہچان گئی ہے اور اب اس افتاد سے نکلنے کی تدبیر سوچ رہی ہے۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بھرپور نظروں سے اشرف کو دیکھا۔ سلیپنگ گاؤن کے کھلے گریبان میں سے اس کا دودھیا جسم جھلک رہا تھا۔ وہ نیل پالش کا برش اٹھانے کے لئے قالین کی طرف جھکی تو جسم اور بھی نمایاں ہو گیا۔ وہ بولی۔ "تم نے مجھ پر ماؤزر تان رکھا ہے لیکن.......... یقین کرو، مجھے پھر بھی تم پر غصہ نہیں آرہا۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی جس نے تمہیں اتنا برہم کیا ہے۔ تم یہ اسلحہ ایک طرف رکھ کر اطمینان سے بیٹھو، میں تمہاری ہر بات سنوں گی۔" کوشش کے باوجود اس کے لہجے میں لرزش تھی۔

"میں تجھے کچھ سنانا نہیں چاہتا ہوں۔" وہ غرایا۔

ارمان نے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی ناکام کوشش کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "دیکھو، اگر تم بیمار ہو تو.......... تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسا روگ نہیں جس سے چھٹکارا ممکن نہ ہو.......... مم.......... میرے سیف کی چابی اس سامنے والے گلدان کے نیچے پڑی ہے۔ وہ سیف کھول لو۔ اس میں جو کچھ ہے لے لو۔ تم دنیا کے جس ملک میں چاہو گے جا کر اپنا علاج کرا سکو گے.......... تمہاری زندگی بدل جائے گی۔"

"میری زندگی تو بدل چکی ہے اور اب میں تمہاری زندگی بدلنے یہاں آیا ہوں۔ مجھے سیف اور اس میں رکھی دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے.........." اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اپنی تمام تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لئے۔ میں تم سے اپنی تمام محرومیوں کا حساب لوں گا۔ تم نے بہت بچپن سے مجھے اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تمہارے خواب دیکھے پھر ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے میں نے کم عمری میں ہی اُس بازار کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ مگر وہاں بھی مجھے سکون نہیں مل سکا بلکہ میری طلب میں مسلسل اضافہ

ہوتا رہا۔ ہر طوائف کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی مجھے تمہارا خیال رہتا تھا۔ میں ان سب میں تمہیں تلاش کرتا تھا مگر ناکامی کے بعد میری پیاس اور بڑھ جاتی تھی اور آج میں سیراب ہونے یہاں آگیا ہوں۔"

ارمان کا خوف کم ہونے لگا تھا۔ اس کی خوف سے پھیکی پڑتی رنگت میں زندگی دوبارہ لوٹنے لگی تھی۔

"اس کے بعد تم واپس لوٹ جاؤ گے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"بالکل' اس کے علاوہ مجھے کچھ درکار نہیں ہے۔" اشرف نے جواب دیا۔

"اور اگر میں انکار کردوں تو.........؟"

"تم اس وقت انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" یہ کہتے ہی اشرف اس پر جا پڑا۔

اشرف کی وحشت ارمان کے لئے ایک بالکل نئی شے تھی۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت کی کوشش ہی نہیں کی جس پر پہلے پہل اشرف کو بھی شدید حیرت ہوئی مگر پھر اس کی حیرت اس کی وحشتوں کی شدت میں بہہ گئی۔

اس کے بعد کا وقت بہت تیزی سے گزرا۔ صبح جب اشرف کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ارمان کو گہری اور پر سکون نیند میں ڈوبے ہوئے پایا۔ اسے دیکھ کر اشرف کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اٹھا اور جس طرح گھر میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل آیا۔

☆==========☆==========☆

تارا کی عجیب کیفیت تھی۔ اشرف گزشتہ تمام رات گھر سے باہر رہا تھا اور صبح جب لوٹا تھا تو جسمانی پژمردگی کے باوجود اس کے انداز میں سرمستی اور سرخوشی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ آیا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔ تارا اس کے ماضی سے بہ خوبی واقف تھی جس کے باعث عجب عجب خیال نشتر بن کر اس کے دل و دماغ میں چبھ رہے تھے۔

اب پھر رات ہونے کو آئی تھی اور اشرف غائب تھا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جب اشرف تارا کے کمرے میں آیا اور محبت بھرے انداز میں پکارا۔ "تارا کیا سو گئی ہو؟"

تارا کب سوئی تھی وہ تو کب سے جاگ رہی تھی۔ اشرف کی آواز پر فوراً اٹھ بیٹھی۔ "نہیں میں جاگ رہی ہوں۔"

"اچھا تو آؤ آج کچھ باتیں کریں گے۔" اشرف نے کچھ عجب طرح کی یاسیت سے کہا اور تارا چونک اٹھی۔

اشرف اس کی کیفیت سے بے خبر تھا۔ وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولنا شروع کردیا۔ "تم میرے حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہو۔ میرا کوئی بھی کارنامہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم نے مجھے چاہا' مجھ سے محبت کی اور مجھ سے شادی کرکے محبت کی انتہا کردی۔ تم سوچتی ہو گی کہ شاید میں تم سے ناراض ہوں' اس شادی پر خوش نہیں ہوں۔ ایسا نہیں ہے اور ایسا ہے بھی۔ شادی ہونے سے پہلے تک میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھا مگر شادی کی رات وہ قیامت کی رات تھی جب میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔ میں لٹ گیا' میں برباد ہو گیا۔" وہ عالم خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ "تم جانتی ہو میری بربادی کی ابتداء کہاں سے ہوئی تھی؟" اس نے پوچھا پھر خود ہی جواب دینے لگا۔ "میری بربادی کی ابتداء فلم اسٹار ارمان سے ہوئی۔ اس نے میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ تمہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی تھی۔ میری خوشیوں کی سیج سجی تھی۔ شادی کی رات طوطے کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ میں اسے خون دینے کے لئے اسپتال گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا' میں اپنی برباد زندگی کا اصل روپ دیکھنے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے میرا خون ٹیسٹ کیا اور مجھے روک لیا۔ رات رات میں میرے دو تین ٹیسٹ اور ہوئے اور پھر مجھے پتا چلا کہ میں دولھا نہیں ہوں' میں تو قبر میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا ہوا مریض ہوں۔ کسی بھی وقت مجھ پر منوں مٹی سوار ہو سکتی ہے۔ اپنی خوفناک بیماری کا پتا چلنے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے قریب جاؤں۔ اس تارا کے قریب جاؤں جس نے میرے لئے محبت اور قربانی کی اخیر کردی تھی۔ میں اس کے صلے میں اپنی خواہشوں کی خاطر' اسے موت دے دیتا تو مجھ سے بڑا کمینہ اور کون ہوتا۔ میں اب تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے ایڈز ہو چکی ہے۔" تارا چونک اٹھی مگر اس کے منہ سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔

"میں نے شادی کے بعد چند جو ہفتے گزارے ہیں' ان کی تکلیف کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ تمہارے قریب رہ کر صبر کا ایک بڑا لمبا امتحان میں نے دیا ہے۔ یہ دن بڑے مایوس

اور بے چین گزرے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ اپنی برباد زندگی کا حساب کس سے مانگوں۔ میں نے بہت سوچا.......... میں جانتا ہوں مجھے ایڈز کی بیماری ایک طوائف سے لگی ہے۔ اس کا نام رانو تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی.......... لیکن رانو کے پاس مجھے لے کر کون گیا تھا؟ ارمان لے کر گئی تھی.......... ہاں' ارمان لے کر گئی تھی۔ میرے کچے ذہن کو گندگی سے لت پت کرنے والی ارمان تھی۔ میں نے چودہ سال کی عمر میں ''کارنامے'' انجام دینے شروع کر دیئے تھے۔ پتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ میرے دماغ پر ارمان کا قبضہ تھا۔''

اسے اچانک کھانسی کا دورہ پڑا۔ حلق سے گیں گیں کی آواز نکلنے لگی۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور سگریٹ کو قریبی ایش ٹرے میں مسل کر بولا۔ ''پچھلے دنوں میں' میں نے بہت سوچا ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہو۔ میں دنیا بھر کی ڈشیں' وی سی آر' لچر فلمیں اور گندی تصویریں اس میدان میں جمع کروں' ان پر ہزاروں لیٹر پٹرول چھڑک کر انہیں آگ لگا دوں.......... یا اس طرح کا کوئی اور ایسا کام کروں جس سے آج کی نوجوان نسل کو برباد کرنے والی ہر برائی جل کر راکھ ہو جائے.......... مگر پھر سوچا' یہ تو سب خیالی باتیں ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا.......... ہاں تارا' ایسا نہیں ہو سکتا.......... برائی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ میں یہ ساری برائی ختم نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا نا..........؟ لیکن.......... لیکن تارا! میں برائی کی بڑی بڑی جڑوں میں سے ایک جڑ کو تو نشانِ عبرت بنا سکتا ہوں.......... میں مشہور فلم اسٹار' ہدایت کار اور فلمساز ارمان کو اپنے ساتھ قبر میں تو لے جا سکتا ہوں.......... میں لے جا سکتا ہوں نا؟'' اس کی آنکھوں میں وحشت کی چمک تھی۔

تارا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ حیرت سے گم صم بیٹھی تھی۔

اشرف کو تارا کی کیفیت کا کچھ علم نہیں تھا وہ تو اپنا اندر تارا کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ ''ارمان کو مارنا میرے لئے مشکل نہیں تھا مگر وہ مر کر اور بڑی ہیروئن بن جاتی جبکہ میں اسے عبرت کا نشان بنانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا لوگ اس سے اور اس کے ذریعے پھیلنے والے مرض سے نفرت کریں۔ میں گزشتہ رات اس کے گھر گیا اور اپنا ایڈز اسے بھی دے آیا۔ اب وہ بھی مرے گی۔ مجھ سے کچھ عرصے بعد مرے گی مگر اس کی موت خاموشی کی موت نہیں ہوگی۔ ایک اذیت ناک موت ہوگی۔ لوگ اس سے دور بھاگیں گے کوئی اس

کے قریب جانا پسند نہیں کرے گا۔ ہاں تارا اب وہ مرے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اشرف کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک ابھری مگر پھر دوبارہ پژمردگی چھا گئی۔ ''اور تارا! یہی وہ وجہ تھی کہ جس کے باعث میں تم سے گریزاں تھا اور آئندہ بھی رہوں گا۔ میرا شباب گہنا چکا ہے۔ میں بوڑھے شباب کی جیتی جاگتی تصویر ہوں اور تم سے التجا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کو برباد نہیں کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم نے محبت میں بہت بڑی قربانی دی ہے۔ اب میں تم سے کوئی اور قربانی نہیں مانگ سکتا۔ خدا کے لئے تارا مجھے چھوڑ دو۔'' وہ سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تارا گم صم تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ بہت دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر اشرف کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ''تم نے اپنے مجرم کو سزا دے دی۔ اب میں اپنی محبت کا خیال رکھوں گی۔ میں تمہاری محبت ہوں' تمہاری بیوی ہوں' تمہارے اور اپنے آخری سانس تک تمہارا ساتھ دوں گی' میں تمہاری بیوی ہوں۔ میں تمہاری بیماری کو تو ختم نہیں کر سکتی مگر میں اس کی اذیت کو کم تو کر سکتی ہوں۔ تم نہیں جانتے اشرف جب عورت کسی سے ایک بار محبت کر لے تو پھر وہی اس کے لئے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور کرتی رہوں گی۔'' وہ ایک عزم سے بول رہی تھی اور اشرف بہتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا' دیکھے جا رہا تھا۔

☆========ختم شد========☆
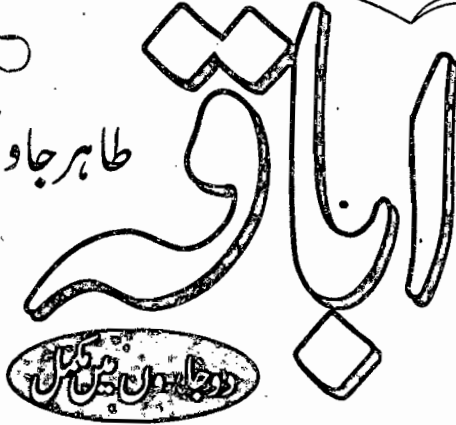
اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
طاہر جاوید مغل
قیمت فی جلد
250
روپے
دو جلدوں میں مکمل
خونخوار منگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک۔
کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک وحشی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر منگول بھی کانپ اٹھتے تھے۔
شیر خوارزم جلال الدین نے کیا قسم کھائی تھی؟
پہاڑوں سے ٹکرانے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور طوفانوں سے الجھنے والے وحشی دیوانے کی داستانِ حیرت۔
تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے کشید کیا ہوا ناقابل فراموش ناول۔
بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کا پتہ:۔
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور